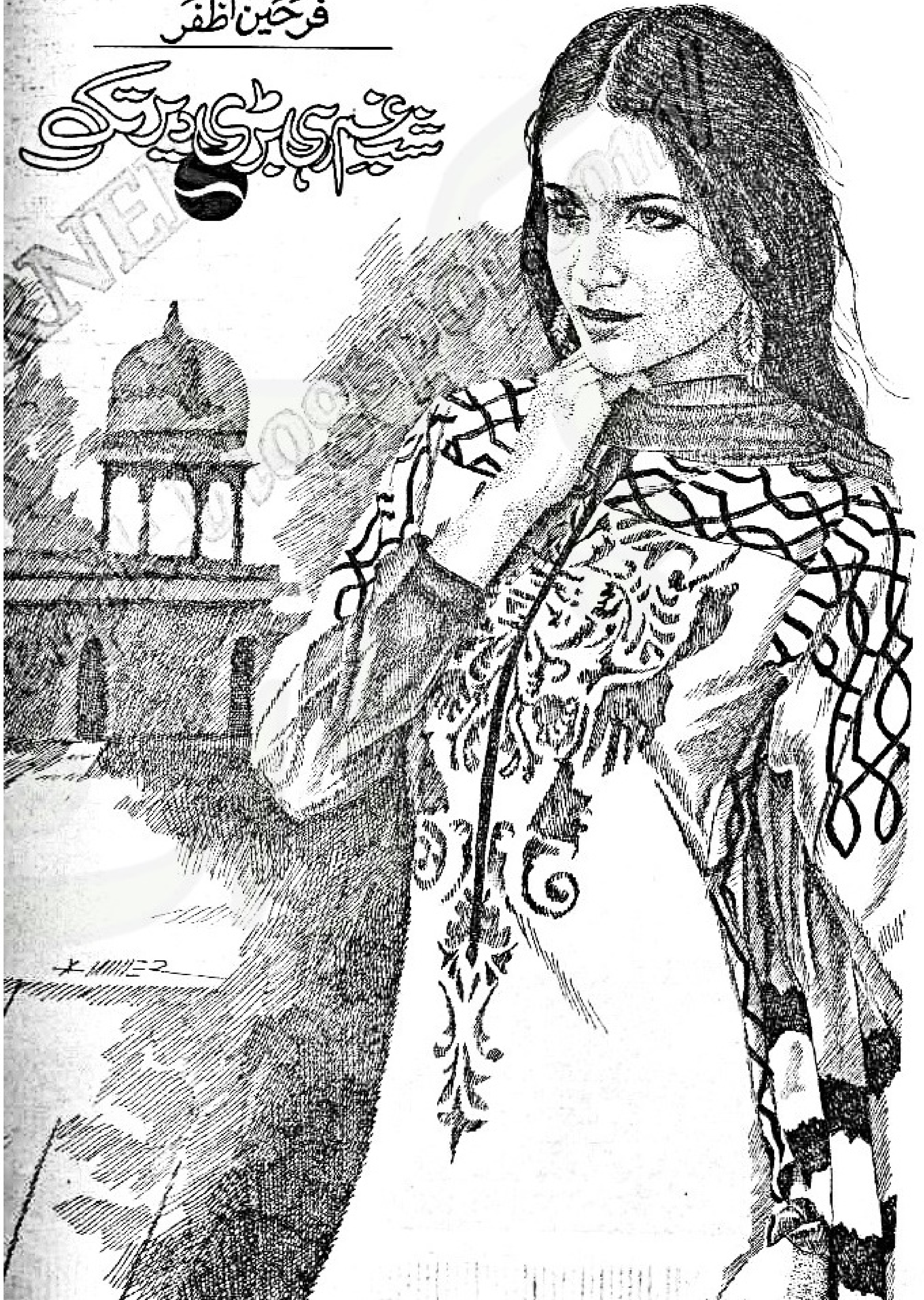
مکمل ناول

فرحین اظفر

شامِ غم بڑی دیر تک



مکمل ناول

شب غم ہے بڑی دیر تک

فرحین اظفر

کالج کے گراؤنڈ میں رونق لگی ہوئی تھی۔ بے فکر نوعمر لڑکیاں کینٹین سے خریدی گئی کھانے پینے کی اشیا لے کر وہیں آ بیٹھی تھیں۔

"او مائی گاڈ سیما۔ لک ایٹ دس پکچر۔"

ایک لڑکی نے ادھ کھایا سموسہ اٹھا کر چکنے چکنے اخبار کو پورا کھولا۔

"افوہ! کتنی خوف ناک لگ رہی ہے۔" دوسری لڑکی ترحم بھرے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"خوف ناک نہیں ہوگی یار۔ اس نے اپنے منہ پر تیزاب ڈالا ہے۔"

"او مائی گاڈ! اتنی ہمت کیسے کی ہوگی اس نے۔"

"پڑھوں ذرا کیا لکھا ہے۔" ذرا دیر کے لیے اس نے اخبار کے ٹکڑے پر نظریں جمائیں پھر منہ بنایا۔

"اونہہ۔ یار! کال گرل تھی کوئی۔"

اس نے اخبار کا گولا بنا کر دور اچھال دیا۔ وہ خبر کی تفصیلات پڑھ چکی تھی۔

"ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ڈال دیا ہوگا کسی پرانے ناکام عاشق نے لے جا کے منہ پر۔" اس کی آواز میں حقارت تھی۔

"تیزاب منہ پر ڈالنے سے کوئی مرتا تو نہیں۔" دوسری لڑکی نے انگلی سے کھٹی چٹنی چاٹی۔

"چلو بھئی۔ ایسی تو جانے کتنی روز جیتی مرتی ہیں۔ کرتی کیوں ہیں ایسے منہ کالا کرنے والے کام۔"

دوسری لڑکی نے آخری چٹخارہ لے کر اپنا اخبار بھی دور پھینکا اور کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لے کر کھڑی ہو گئی۔

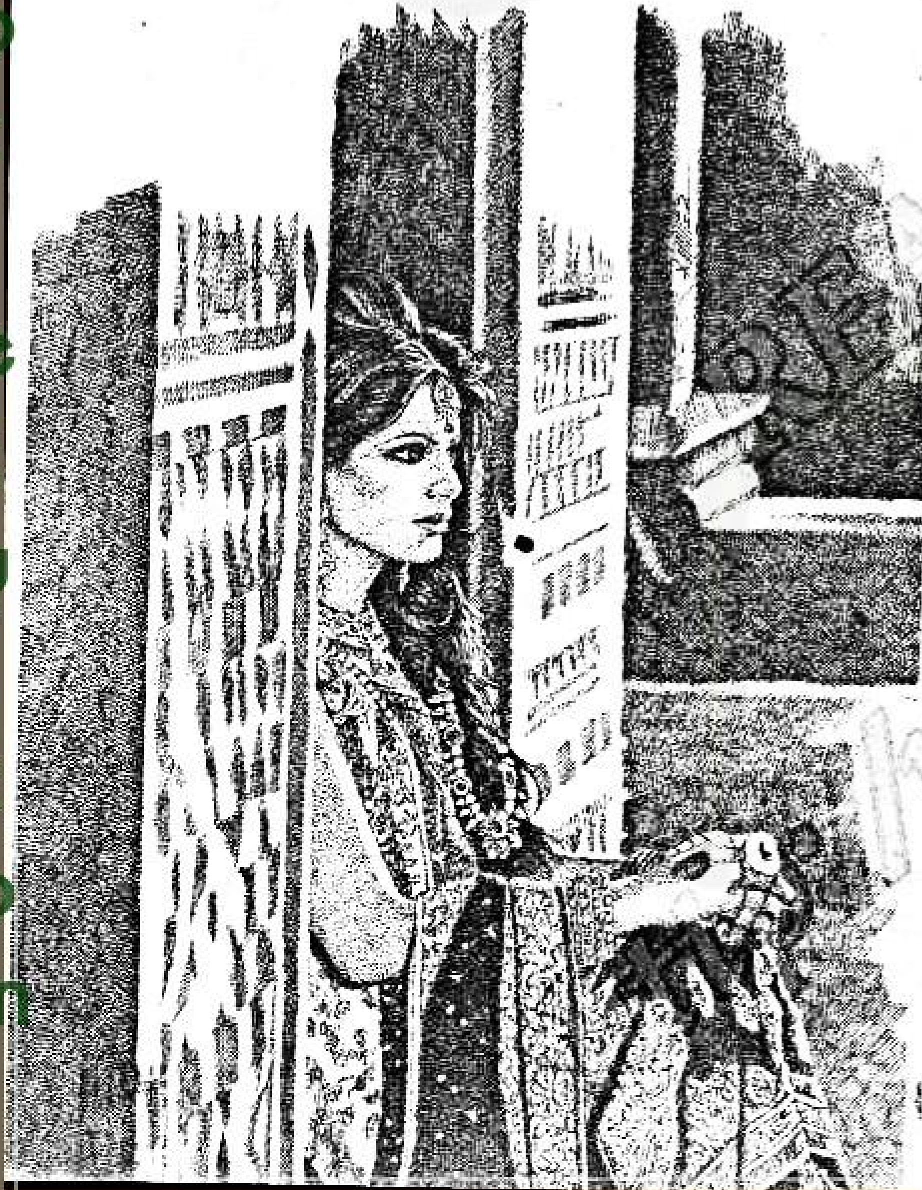
"چلو پیریڈ ہونے والا ہے۔"

دونوں لڑکیاں اب باتیں کرتی گراؤنڈ سے باہر جا رہی تھیں۔

اخبار کے گندے ٹکڑوں پر لپکتی، بھنکتی مکھیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اور لڑکی کی مڑی تڑی تصویر پر بھی۔

✲ ✲ ✲

آج انہیں پھر بری طرح دورہ پڑا تھا۔ پیٹ کی رگیں



کھینچ کر حلق میں چلی آئی تھیں۔ پوری طاقت لگا کر بھی اپنے نیم مردہ وجود میں سانس بھرنے سے قاصر ان کا جسم ہانپ رہا تھا۔ انہوں نے پھر زور لگایا۔
پسلیاں ذرا کی ذرا پھولیں۔ اگلے ہی لمحے پھر نمایاں ہو گئیں۔ پچکے ہوئے پیٹ کی ڈھیلی کھال کمر سے جا لگی تھی۔ آنکھیں ابل رہی تھیں۔ ہونٹ تھرا رہے تھے۔

"ای۔ ای! یہ لیں۔"

کسی نے ان ہیلر ان کے منہ سے لگایا اور بے قراری سے اس کا بٹن دبایا۔ پف سے پھوار نکلی اور کسی نے دوبارہ ان کے تن مردہ میں زندگی ڈال دی۔ ناہموار ہچکولے کھاتا وجود پھر سے تھمنے لگا۔

"چچی۔۔۔ اب کیسی طبیعت ہے۔"

خوف زدہ نظریں ان پر جمی تھیں۔

"اور ان آنکھوں کا آخری سہارا میں ہی تو ہوں اور میرا آخری سہارا یہ۔۔۔ یہ۔۔۔" انہوں نے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر کے ذرا کی ذرا سر ہلایا۔ سامنے کھڑے سہمے ہوئے وجود میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم سے باتوں اور ہنسی کی تیز ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ قدرے بلند آواز میں گانے بج رہے تھے۔ خوشبوئیں، سگریٹ اور پرفیومز، قیمتی کپڑوں کی سرسراہٹیں۔ بابر سلطان کی جدید طرز کی اس کوٹھی میں گھر کے افراد کم تھے۔ بلکہ بہت ہی کم۔ ہاں نوکروں کی تعداد قابل ذکر تھی یا پھر کمروں کی۔

اس کے بے چین قدم ان ہی کمروں میں مشرقی اور مغربی دیواروں کا فاصلہ ناپتے تھک چکے تھے۔ دکھتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے دو، تین جھٹکے دیے۔

"او میرے خدا۔۔۔ کس گناہوں کی سزا ہے یہ۔"

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"یقیناً ایک معصوم دل توڑنے کی، کسی کی حق تلفی کی سزا ہے یہ۔" اس کے اندر سے آواز ابھری۔ وہ دھیان لگا کر سننے لگی۔

ایک لمحے کے لیے پیش منظر، پس منظر میں چلا گیا اور پس منظر۔۔۔ لیکن وہ پوری طرح ڈوبنے نہیں پائی تھی کہ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔

وہ خوف زدہ نظروں سے دیکھتی کھڑی ہو گئی۔

"تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو۔" دروازے میں کھڑا شخص شرربار نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"بس جا رہی ہوں، تیار ہونے۔" اس نے تھوک نگل کے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سنولائے ہوئے ہاتھ پیر اور جھکی لرزتی پلکوں والی لڑکی آفس کے ایک کونے میں زمین پر بیٹھی تھی۔

"کون ہے یہ؟" اس نے فضل داد سے پوچھا۔ جو اسے وہاں لے کر آیا تھا۔ اس نے گھٹنے موڑ کر ہاتھ ان پر باندھے ہوئے تھے اور ایک بڑی سی بدرنگ اوڑھنی میں خود کو چھپایا ہوا تھا۔

"سائیں غریب لڑکی ہے، کام مانگنے آئی تھی، میں یہاں لے آیا۔"

"کام۔۔۔ کیسا کام؟"

"کوئی بھی کم سائیں، مانی جے لائے۔" (روٹی کے لیے)

اس نے ہنکارا بھرا، پھر اسے دیکھا۔ ان کے این جی او میں اس قسم کے لوگوں کی آمد کوئی نئی نہیں تھی۔ خاص طور پر سیلاب سے مچنے والی تباہ کاریوں کے بعد۔

"چھانالو آھے؟" (نام کیا ہے۔) اب کے اس نے براہ راست اسے دیکھا۔ جواب ندارد۔

"شاہل نام ہے جی۔"

"گھر والے کہاں ہیں؟"

"گھر والا کوئی نہیں ہے، ایک باپ تھا، سیلاب کے بعد ڈینگی کی وبا کا شکار ہو کے مر گیا۔ فضل داد ہی بول رہا تھا۔

"سلائی کڑھائی وغیرہ آتی ہے اسے، پوچھو اس سے۔"

فضل داد نے مڑ کر سندھی میں اس لڑکی سے پوچھا۔ وہ سمجھ رہا تھا وہ صرف خوف زدہ ہونے کی وجہ سے اس کو جواب نہیں دے پا رہی تھی۔

وہ فضل داد کو بتا رہی تھی کہ اسے سب کام آتا ہے۔ یوں ہی اس کا چہرہ تکتے، اس کی بات سنتے اسے رباب آنٹی کی یاد آگئی۔ انہوں نے اس سے کسی کام والی کے بارے میں کہا تھا۔ انہیں ایک فل ٹائم ملازمہ کی ضرورت تھی۔

"شہر ہندوو کم جے لائے۔" (شہر جاؤ گی کام کے لیے) اس نے بے اختیار پوچھ لیا۔ جواب میں وہ بات ادھوری چھوڑ کر ان ہی خوف زد نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اتے کپڑا مانی تے گھر سب ملندو۔" (وہاں کپڑا، روٹی، گھر سب ملے گا۔) اس نے تسلی کے لیے کہا۔ اس نے زور سے نفی میں سر ہلا کر اپنے جسم کو مزید سمیٹا۔

"دیکھو، یہاں کوئی تمہیں یہ سلائی کڑھائی وغیرہ کا کام نہیں دے گا۔ کسی کو یہاں اس کام کی ضرورت نہیں ہے۔ شہر میں ایک سے ایک اچھا کام کیا کرایا مل جاتا ہے۔ تم سے تو لوگ کام کروانے کے بجائے۔۔۔"

وہ ایک دم چپ ہو گیا، باقی بات منہ میں دبالی۔

"اسے سمجھاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

اسے قریب آتے دیکھ کر اس نے زمین کو چھوتا پلو سمیٹ کر گود میں رکھا۔ اس کے ہاتھوں میں اضطراب تھا۔ وہ یقیناً "بہت خوف زدہ" تھی۔ وہ ذرا کی ذرا اس کے قریب رکا۔ پھر پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"مانی کھاٹینڈی۔ بوکھ لگی ہوندی۔" (کھانا کھاؤ گی، بھوکی ہو؟) اس نے جواب نہیں دیا، وہ زمین گھورتی رہی۔

"فضل۔۔۔"

"جی سائیں۔" وہ مئودب سا کھڑا تھا۔

"کھانا کھلاؤ اسے اور بتاؤ شہر جانے میں بہت فائدہ ہے۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"بی بی جی۔۔۔ صاحب نے کہا ہے، جلدی آجائیں۔" سیاہ ستاروں کی جھلمل کرتی ساڑھی میں اس کی دبتی ہوئی رنگت بھی کھل اٹھی تھی۔ شوخ رنگوں کے میک اپ میں اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ ملازمہ سے آگے آگے قدم بڑھاتی وہ ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئی۔ جیسے جیسے ڈرائنگ روم سے اس کے قدم قریب ہوتے جا رہے تھے۔ دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔

اندر سے اٹھتے باتوں کے شور میں زنانہ اور مردانہ دونوں آوازیں شامل تھیں۔

نتھنوں سے ٹکراتی پرفیومز کے ساتھ گھلی ملی، تلخ ناگوار بو دروازے پر پہنچ کر اس کے اعصاب چٹخانے لگی۔ ایک لمحہ رک کر اس نے تمام تر حواس مجتمع کر کے دھیان، دل، دماغ اندر کی سمت لگایا اور کامیاب ہو کر اندر قدم رکھا۔

"آئیے آئیے۔۔۔" سامنے ہی بیٹھے ایک موٹی توند والے شخص نے فوراً" اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس کے ہونٹ کمینگی انداز میں دائیں بائیں پھیل گئے۔

"وہ آئے محفل میں اتنا تو ہم نے دیکھا۔۔۔ آں۔"

ایک ادا سے اس کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھاتے ہوئے اس نے شعر پڑھا۔ "پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔" اس کے منہ سے اٹھتے ناگوار بھبکے اس کی برداشت سے باہر تھے۔ بے ساختہ بالکل نامحسوس انداز میں اسے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے وہ سامنے والی نشست پر براجمان شخص کے پہلو میں ایک ادا سے ٹک گئی۔

برابر میں بیٹھا مرد بجائے کھسک کر پرے ہونے کے کچھ اور نزدیک آگیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کر دیکھا۔ دائیں طرف اس کا شوہر آس پاس اسی کی طرح کی بے باک عورتوں میں گھرا ستائشی اور فخریہ انداز میں اسے دیکھ رہا

تھا۔
نظر ملنے پر اس نے اطمینان کا اظہار کیا اور اسے اپنا اطمینان رخصت ہوتا محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

چھوٹے سے صحن میں سرما کی دھوپ دم توڑ رہی تھی۔
اس نے اپنی سوراخ والی جرابوں سے جھانکتی پھٹی ہوئی ایڑیوں کو دیکھا۔ کبھی یہ ایڑیاں بے حد نرم ملائم اور گلابی ہوتی تھیں۔
"بس کرو کتنا رگڑ رگڑ کر دھوؤ گی۔ گھس گئیں تو قد چھوٹا ہو جائے گا۔" نمو اس کی صفائیوں سے چڑتی تھی۔
"کس کو دکھانی ہیں یہ کلائیاں، یہ پاؤں۔" اس کی جلی کٹی وہ دن بھر مسکرا کے سنتی رہتی۔
اب اس کی نظر اپنی دھبے دار، سوکھی سنولائی کلائی پر بھٹک رہی تھی۔
"سی... ی... ی..." ایک بار اس پر جلتے تیل کے چھینٹے آ پڑے تھے اور ایک مضبوط مردانہ ہاتھ کی گرفت میں اس کی کلائی مچل اٹھی تھی۔
"کچھ نہیں ہوا۔ معمولی سی چھینٹ ہے۔"
"دیکھنے تو دو نا، دیکھو، کیسی سرخ ہو رہی ہے۔"
"اچھا... میں کچھ لگاتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر تسلی دی۔ اسے علم نہ تھا۔ اس کا لہجہ کسی کے دل پر جلتے چھینٹے ڈال گیا تھا۔ اس نے دروازے سے چچی کو پلٹتے دیکھا تھا اور ڈر گئی تھی۔
"ہونہہ!" ایک تلخ مسکراہٹ نے اس کے لبوں پر دم توڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

"بیوٹی فل۔" وہ عورت اس کی ٹھوڑی چھو کر بولی تھی۔ اس نے ناسمجھی کے سے انداز میں بابر سلطان کو دیکھا۔
"وہ ڈارلنگ... یو آر ریئلی ویری بیوٹی فل۔" اس کی نظروں اور چہرے پر ستائش تھی۔ کمرے میں موجود دوسرے نفوس یوں خوش ہو کر ہنسے جیسے ان ہی کی تعریف کی گئی ہو۔ کمرے گلے سے چھلکتے بے تاب جسم نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ وہ بے اختیار کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئی۔
"واقعی عورت ہو تو تم جیسی۔" اس نے پھر ناسمجھی سے اس تعریف کو وصول کیا۔ "یہ سانچے میں ڈھلا جسم، یہ چمپئی ملیح رنگت، اس کے آگے وہ پھیکے شلجم کی کیا اوقات، یہ تیکھے نقوش۔" کمرے میں یک دم ہی خاموشی چھا گئی۔ جیسے سب اس قصہ خوانی کو سننے میں محو ہو گئے تھے۔
"تم ہماری پارٹیز اٹینڈ کیوں نہیں کرتیں جان۔ یہ حسن کوئی چھپا کے رکھنے کی چیز ہے۔"
اس نے ایک ادا سے اس کی ساڑھی کا سیاہ مہین پلو کندھے سے گرا دیا۔ وہ ششدر رہ گئی اور سب یوں قہقہے لگانے لگے۔ گویا یہ حرکت پہلے سے ان کے علم میں تھی۔
نیم عریاں چست لباس پہنے بیٹھی عورتوں کے درمیان اپنے شوہر کو قہقہے لگاتے دیکھ کر اس کے ہاتھ کپکپا گئے۔

☼ ☼ ☼

کوریڈور میں تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے وہ فضل کے برابر آ گیا۔
"ہاں فضل... کھڑی رپٹ آھے۔" (کیا رپورٹ ہے۔)
"سائیں! اس نے کھانا کھا لیا ہے۔ پر وہ بات ماننے کو تیار نہیں۔"
"تب تک وہ اپنے کیمپ میں ہی رہے جا کے۔ میں کچھ پیسے دے دوں گا۔" وہ آفس کے اندر گم ہو گیا۔
"سدا جیوے سائیں۔" فضل داد کو علم تھا وہ ایک ضرورت مند کو بالکل ٹھیک جگہ لے کے آیا ہے۔
"اور سنو۔" وہ لڑکی کے پیچھے پیچھے اپنے آفس سے نکلا۔
"سائیں..." فضل داد نے ہاتھ جوڑے۔

"اپنے کیمپ تک چھوڑ کے آؤ اور جلد ہی کسی گھر میں اس کا بندوبست کرو۔ اس کا روز ادھر آنا ٹھیک نہیں۔" بات ختم کر کے اس نے نظریں لڑکی سے ہٹا کے فضل داد پہ جمائیں۔
"تم نہیں جانتے فضل! عورت کی عزت کتنا نازک آبگینہ ہوتی ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور ہو جاتی ہے۔" وہ دل ہی دل میں فضل داد سے مخاطب تھا۔ نظریں بظاہر لڑکی کی ایڑیوں پر جمی تھیں۔
سیاہ پڑتی پھٹی ایڑیاں، کسی کی نرم گلابی ایڑیوں میں بدل رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سامنے بیٹھی طرح دار لڑکی اپنے ناخن فائل کرتی مسز رباب کو مسلسل زچ کر رہی تھی۔
"آخر تمہیں اعتراض کس بات پر ہے۔"
"ایک دم اجڈ گنوار انسان ہے وہ، نہ ایٹی کیٹس، نہ مینرز۔"
"تو تم کسی سے ملتے وقت اس کی خوبیاں دیکھتی ہو، مت بھولو کہ تم اصل میں ہو کیا۔"
سخت لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتی وہ اٹھ کے اس کے سر پہ جا پہنچیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کے کندھے پر ان کا ہاتھ رکھا تھا۔ انگلیوں کی چبھن محسوس کی جا سکتی تھی۔
"آج میں تمہاری جگہ کسی اور کو بھیج دیتی ہوں۔ بٹ نیکسٹ ٹائم، ڈونٹ فار گیٹ وٹ ہو آئی ایم۔" (آئندہ یہ مت بھولنا کہ میں کون ہوں۔) مجھے تم جیسی اڑیل گھوڑیوں کو سدھانے اور ان کی چمڑی کسوانے کا فن خوب آتا ہے۔" ان کے سرد لہجے کی سفاکی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی تھی۔ انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔
"ناؤ یو بیٹر گو اپ اسٹیئرز۔ سم ون از ویٹنگ ویئر فار یو۔" (اب تم اوپر چلی جاؤ، کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے وہاں۔) وہ گہری سانس لے کر اوپر کی طرف بڑھ گئی۔

اس جہنمی زندگی میں آرام اور سکون کا ایک ذرا سا راستہ، اپنی سو کالڈ آنٹی کے حکم کی بجا آوری کی صورت میں ہی نکلتا تھا۔
اوپر کون تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر وہ چاہتا کیا تھا۔ یہ اسے بخوبی معلوم تھا۔

☼ ☼ ☼

سرما کی مریل سی دھوپ میں امی کے پیروں کی مالش کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کے داہنی دیوار کو دیکھا۔ سدا بہار کے اکلوتے پودے پر پھولوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔
"یہ کیسا سدا بہار کا پودا ہے۔ اس پر پھول کیوں نہیں آتے۔" اس کا دھیان بھٹک چکا تھا۔
"پورا سال اس پر پھول آتے ہیں۔ ہر موسم میں بہار کا موسم، سچ پوچھو تو یہ پودا بالکل تم جیسا ہے۔" کسی کی یاد بھی سدا بہار جیسی ہی تھی۔

تمہاری یاد کا موسم
جو ہر اک دکھ سے گہرا ہے

نہ جانے کتنی مدت سے ہمارے من میں ٹھہرا ہے
مگر تم نے نہیں جانا مگر تم نے نہیں سوچا
تمہارے پیار کا موسم
جو ہر موسم سے پیارا تھا
میرے ان بیکراں لمحوں کا اک واحد سہارا تھا
مگر تم نے نہیں سمجھا مگر تم نے نہیں سوچا۔
تمہارے بعد کا موسم
ایک کالی گھات جیسا ہے
جو جیتی ہے نہ ہاری ہے۔ اک ایسی مات جیسا ہے
مگر تم نے نہیں دیکھا۔ مگر تم نے نہیں سوچا۔

"شاید ماحول کا اثر ہو گیا ہے اس پر۔" اس نے خود کلامی کی۔

"اے کیا کہہ رہی ہے۔" چچی نے ہاتھ کا چھجا بنا کر مندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کہہ رہی ہوں۔ اس گھر میں تو سدا بہار کے پودے پر بھی بہار نہیں آتی۔" اس نے بات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"مجھے تو... تو پاگل لگنے لگی ہے۔ سارا دن دیواریں تکتی ہے۔ اب کیا ان سے باتیں بھی شروع کر دیں۔"

"آپ نے مجھے پاگل کرنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے کیا چچی۔"

"کیوں... میں نے کیا... کیا ہے؟"

وہ خاموش رہی۔

انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ یوں بھی وہ جانتی تھیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

"اب کہاں چلی۔ دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جایا کر۔" چپل اڑستے وہ ذرا کی ذرا ٹھہری۔

"میں نہیں ٹھہر سکتی۔ مجھے وحشت ہوتی ہے۔" وہ اٹھ کے چلی گئی۔ پیچھے وہ بڑبڑاتی رہیں۔

"چل دفع دور، میں کون سا مر رہی ہوں تجھے پاس بٹھانے کو۔ ہائے نمو! میری بیٹی۔ تجھے بیاہ کے تو میں تیری صورت کو ہی ترس گئی۔ تیری جگہ اسی کو بیاہ دیتی اس سانڈ سے تو بہتر رہتا۔"

ان کی آنکھوں سے اکلوتی بیٹی کی یاد میں آنسو بہہ نکلے۔

☼ ☼ ☼

بیش قیمت فرنیچر اور ڈیکوریشن پیسز سے سجا وسیع و عریض لاؤنج صاحب خانہ کے عمدہ ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

مہنگی ترین لکڑی سے بنا وہ ترچھا بل کھایا صوفہ، جس کے ایک کونے میں وہ سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ پوری طرح آرام دہ ہونے کے باوجود اسے سخت بے آرام لگ رہا تھا۔

"اوہ نو... یہ مسز بابر سلطان تمہارے نازک وجود پر بہت بھاری بھرکم لگتا ہے۔ کین آئی کال یو نوما (میں تمہیں نوما کہہ سکتی ہوں)۔" یہ وہی عورت تھی جسے اس نے کچھ دن پہلے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں اپنی تعریفوں کے پل باندھتے دیکھا تھا۔ آج بابر سلطان اسے اچانک ہی لے کر یہاں چلا آیا تھا۔

"اوہ یہ انگریزی گٹ پٹ اس کی سمجھ میں کہاں آئے گی۔" وہیں ایک صوفے پر بابر نے بھی ٹانگیں پھیلا لی تھیں۔

"سب آ جائیں گی۔ تم فکر مت کرو۔ میں سب سکھا دوں گی۔" وہ قربان ہو جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"جب ہی تو لایا ہوں تمہارے پاس۔" وہ اپنے مخصوص بے ڈھنگے انداز میں ہنسا۔

وہ بھی ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔ لاؤنج میں مکمل خاموشی تھی۔

اس نے جھکی نظروں سے اپنے خاوند کو دیکھا۔ گہرے سرمئی رنگ کا قیمتی سوٹ، اس کی موٹی توند اور گھنی مونچھوں والے بڑے سارے منہ کے ساتھ ذرا بھی بچ نہیں رہا تھا۔ اس کی ساری شخصیت میں ایک بھونڈا پن نمایاں تھا۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔" کولڈ ڈرنک کا گلاس

اس کے لبوں تک جاتے جاتے رک گیا۔

"مجھ سے کچھ کہا۔" اس کی بناوٹی اداکاری بھی اسی طرح کی بھونڈی تھی۔

"پوچھ رہی ہوں۔ یہاں کیوں لائے ہیں مجھے۔" ناچاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہو گئی۔ "گھر چلیں... میرا دل گھبرا رہا ہے۔" اس نے بے چینی سے اس کی منت کی، جانتی جو تھی، یہاں نہ سوال کرنے کی اجازت تھی، نہ انکار کرنے کی۔

"چپکی بیٹھی رہ، جھلی نہ ہو تو..." اور وہ اس کی تو تڑاخ سے پہلے ہی عاجز اور خائف رہتی تھی۔ اس وقت بھی دبک سی گئی۔

اسی وقت مسز رباب نے وہاں قدم رکھا تو ان کے ساتھ ایک الٹرا ماڈ قسم کی لڑکی تھی۔

"او... لکنگ چارمنگ... میک اوور کرنا ہے۔" وہ اسی سے پوچھنے لگی۔ آواز اور انداز بھی ماڈرن تھے۔

"ہاں اسے لے جاؤ اور سنو... بی کیئر فل پلیز ہاں۔"

وہ خاصے مصروف انداز میں اس سے مخاطب تھیں۔ آخر میں ان کا لہجہ، کچھ معنی خیز ہو گیا۔

وہ خوف زدہ سی اپنی جگہ سے اٹھی، لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی بیوٹیشن نے اسے بازو سے تھاما اور آگے بڑھ گئی۔ وہ کچھ گومگو کے عالم میں بے جان سی اس کے ساتھ چلتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

دودھ کی پتیلی خالی تھی۔

اسے یاد آیا، دودھ کی قیمت میں ہوتے مسلسل اضافے سے گھبرا کے اس نے کل ہی دودھ والے کو فارغ کر دیا تھا کہ اب آنے کی تکلیف نہ کرے۔ لیکن اب وہ کرے کیا۔

وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن پیٹ میں دوڑتے چوہے کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس نے بے تابی سے سلیب پر ہاتھ مارا۔

مڑی تڑی تھیلی میں گڑ کی ڈلی پڑی تھی۔ جلدی سے روٹی کا ڈبہ کھول کر رات کو جان بوجھ کر بچایا گیا باسی روٹی کا ٹکڑا نکالا۔ گڑ کی ڈلی کے گرد لپیٹا اور ٹھونس لیا۔

"امی! دروازہ بند کر لیں۔" بھرے منہ سے آواز لگاتی وہ دروازے کی طرف لپک گئی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ دل میں عہد کر رہی تھی کہ پہلی تنخواہ ملتے ہی وہ اپنے لیے ایک سوئٹر تو لے ہی لے گی۔ یہ پتلی سی شال بھلا اس سردی کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔

لیکن ابھی اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے میں پورے انیس دن باقی تھے۔ تب تک یقیناً ضروریات کی فہرست طویل سے طویل تر ہو جانا تھی۔ لیکن اس بار اس نے سوچ لیا تھا۔

اس بار وہ اپنی محنت کی کمائی پہلے خود پر اور بعد میں بلکہ بالکل آخر میں گھر والوں پر خرچ کرے گی۔ اس نوکری سے منسلک ہی اسے کتنی اشیا کی فوری ضرورت تھی۔

ایک گھڑی، سوئٹر، چند نئے جوڑے اور جوتے۔ بننے سنورنے کا شوق تو اسے پہلے بھی زیادہ نہیں تھا لیکن۔

"سی... ی... ی..." بے ساختہ ٹھٹھر کر اس نے ہاتھ کی خشک پھٹتی ہوئی جلد کو سہلایا۔ "ایک کولڈ کریم یا لوشن تو "فورا" ہی لینا چاہیے۔"

اور اس "فورا" کے حاشیے میں اس کی کتنی ہی ضرورتیں کھڑی دہائی دے رہی تھیں۔ کتنی ہی ایسی چیزیں جن کا ذکر وہ صرف اپنی اچھی اماں سے کر سکتی تھی۔ مگر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بھلا وہ اس کی ماں تھیں ہی کب، وہ تو نمو کی ماں تھیں۔ نمو نعیمہ کی ماں... نمو کی یاد نے گھنٹی کیا بجائی دل میں جیسے اس سے جڑی کتنی ہی یادوں نے یلغار کر دی۔

نمو سے زریاب اور زریاب سے...

کئی سال پہلے سردیوں کے موسم میں اس کے کتنے کام بن کہے ہو جاتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ روشی بہت خوددار ہے اور اسے اس کی خودداری پسند ہے۔ اس کے ہاتھ میں اپنی سیاہ جرابیں اور ایک استعمال شدہ پل

اوور تھا۔

"نئے لاتا تو تم اعتراض کرتیں۔" اس نے دونوں چیزیں اسے تھمائیں۔ "اور اپنے اس لیے لایا ہوں کہ تمہیں میری یاد آتی رہے گی اور تم پہنو گی بھی شوق سے۔"

"اس میں تمہاری خوشبو بھی تو ہے۔" اس نے فوراً" ہی پل اوور پہن لیا تھا۔ اس کے لبوں پر بہت میٹھی مسکراہٹ تھی۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے دل تک رسائی رکھتا تھا۔ اس کی آنکھیں پڑھ سکتا تھا۔

"وہ زبان سے کبھی نہیں کہتی کہ اسے کسی چیز کی ضرورت ہے۔"

"اوہو تو تمہیں کیسے خبر ہو جاتی ہے۔" نمو جل جاتی۔

"مجھے۔" وہ ہنس دیتا۔ "بس ہو جاتی ہے دل کو دل سے راہ۔"

اس کے لبوں پر ایک سرد آہ نے چپکے سے فریاد کی۔ "کاش تمہارے دل کو راہ ہو جائے ایک بار پھر۔ مجھے تمہاری کتنی ضرورت ہے زریاب! کاش تمہیں پتا چل جائے۔" اسکول کی عمارت سامنے نظر آرہی تھی۔

اس نے تمام سوچیں' یادیں ذہن کے کونے میں دھر کر ایک نئے عزم سے احاطے میں قدم رکھا۔

☼ ☼ ☼

"سائیں! وہ شاہل بی بی آئی ہے۔"

"کون شاہل؟" وہ اس وقت بے انتہا مصروف تھا۔

"سائیں وہی کیمپ واری۔۔۔ جیکو بابا بوڑ میں مری ویو۔"

"اوہاں۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ تم نے پتا کیا تھا اس کے لیے کام وغیرہ۔۔۔ تم اسے دیہاڑی دے دیتے ہو' روز کے روز۔"

"تو پھر۔۔۔ کوئی مسئلہ ہے۔" اس نے فضل داد کا "جی سائیں" سن کر بے دھیانی سے پوچھا۔

"سائیں! وہ کہتی ہے اسے وہاں نہیں رہنا۔"

"کیوں؟" وہ ایک دم چونک گیا۔

"پتا نہیں۔۔۔ اس کا کوئی ماما شاما آگیا تھا۔ اس کا پتا کرتا ہوا۔"

"تو پھر؟" اب کے اسے اسکرین پر سے نظریں ہٹانی پڑی تھیں۔

"وہ اس سے ڈری ہوئی ہے۔ کہتی ہے وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔"

وہ کچھ لمحے یوں ہی فضل داد کو دیکھتا رہا۔

"بلاؤ اسے۔۔۔" وہ پھر سے مانیٹر کی سمت گھوم گیا۔

"ہاں بھئی شاہل! کیا بات ہے' کیا مسئلہ ہے۔"

اس دن کی نسبت وہ آج بہتر حلیے میں تھی۔ مگر زیادہ خوف زدہ۔

"سائیں! آج میرے کو شہر بھجا دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔

"کل تک تو تم منع کر رہی تھیں۔ پھر آج اچانک۔"

"سائیں! اور میرا ماما آیا گیا ہے۔ وہ بوہت خراب آدی ہے۔ میرے کو ڈر ہے۔ وہ میرے کو کہیں اور اور کر دے گا۔"

"ادھر ادھر کرے گا مطلب۔۔۔" اب کی بار اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"وہ اپنے ساتھ اپنی کسی جاننے والی کو لایا تھا۔ اس سے پیسے لے کر میرے کو اس کے ساتھ چلتا کر دے گا۔" اس کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔

"سائیں! آپ بڑے لوگ ہیں۔ کسی سے کہہ سن کے مجھے نکلوا دو ادھر سے۔ وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے اور وہ عورت بھی ٹھیک نہیں تھی۔" وہ اب سندھی میں بول رہی تھی اور فریاد کرتے کرتے باقاعدہ رونے لگی تھی۔

"اچھا اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ تم رو و مت۔ میں تمہیں بھجوا دوں گا۔ کل ہی بھیج دوں گا۔ آج تو رک جاؤ۔ میں پہلے بات کر لوں۔ گھبراؤ مت' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"سدا جیو سائیں۔ مولا سکھی رکھے۔" وہ دعائیں دیتی پلٹ گئی تھی۔

اس نے دیکھا' اس کے پیروں میں آج بھی چپل نہیں تھی۔ موسم کی شدت کا اندازہ کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے کپکپا سا گیا۔

"فضل یار۔۔۔ اسے کم سے کم ایک سوئٹر اور سلیپرز تو دے دو' کہیں سے۔"

فضل داد سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"لاؤ نکالو میرا مال۔"

مسز رباب کو واپس آتے دیکھ کر نشے میں بد مست بابر سلطان واپس ہوشیار ہو چکا تھا۔

"پہلے تم نکالو۔" وہ اطمینان سے سامنے صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھ گئیں۔

"نئیں کیا۔۔۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی خماری تھی۔

"چچ۔۔۔ ڈائیورس پیپرز اور کیا اور کتنی بار کہا ہے۔ اتنا مت پیا کرو۔ دن میں بھی ادھر ادھر لڑھکتے رہتے ہو۔ بدبودار کوی۔" وہ کراہیت سے آواز نیچی کر کے بڑبڑائیں۔

"ہی۔۔۔ ہی۔۔۔ ہی۔" وہ اپنے بھونڈے انداز میں ہنسنے لگا۔

مسز رباب کے تیور "مال" وصول کرتے ہی بدل گئے تھے۔ وہ اب خاصے اکتاہٹ بھرے انداز میں اس کے اگلے قدم کی منتظر تھیں۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ برآمد کیا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔ مسز رباب نے لفافہ کھول کر سکون سے متن ملاحظہ کیا۔

"ہوں ٹھیک ہے۔" انہوں نے چیک بک نکالی اور چیک سائن کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ تھامتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"پڑھ تو لو۔۔۔ اتنا ہی اماؤنٹ۔ جس پہ ڈن کیا تھا۔" وہ بھی کھڑی ہو چکی تھیں۔

"یہ غیروں والا سلوک تم ہمارے ساتھ کرتی ہو جانم۔ ہم نہیں' ہمیں تمہاری زبان پہ بھروسا ہے۔"

وہ پاس آکر لگاوٹ بھرے انداز میں ان کی لٹ کو انگلی پر لپیٹ کے بولا۔ مسز رباب نے بے زاری سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"چلو اب چلتے پھرتے نظر آؤ اور سنو۔ آئندہ ذرا صاف ستھرے ہو کے آنا۔"

ان کا کام ہو چکا تھا۔ انہیں اس پر نثار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ حیرت زدہ سی آئینے میں اپنا بدلا ہوا روپ دیکھ رہی تھی۔ بیوٹیشن کے ماہرانہ ہاتھوں نے اسے سرتاپا بدل ڈالا تھا۔ ہیئر کٹنگ، میک اپ اور وہ اسٹائلش کپڑے، جن میں وہ اس وقت قدرے بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے متناسب جسم پر خوب سج رہا تھا۔

"ہاؤ ڈو یو تھنک ناؤ۔" بیوٹیشن مسکرائی۔

"جی۔۔۔" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیسا لگ رہا ہے اپنا آپ۔"

"یقین نہیں آتا، میں اتنی خوب صورت بھی لگ سکتی ہوں۔" بیوٹیشن مسکرا کے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

"او ڈارلنگ۔۔۔ یو آر لکنگ ویری پریٹی۔" مسز رباب اندر آ کے اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔ وہ تھوڑا سا شرما گئی۔

"چلو آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے لاؤنج میں لے آئیں۔ لاؤنج خالی تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ بابر۔۔۔" وہ خالی لاؤنج دیکھ کر تھوڑا سا گھبرا سی گئی۔

"بابر۔۔۔" خراماں خراماں سی مسز رباب ایک دم کچھ اٹک گئیں۔

"ہاں۔۔۔ وہ ایکچوئلی اسے ایک میٹنگ میں جانا پڑ گیا۔ بالکل اچانک۔ بٹ یو ڈونٹ وری۔ تم آج کا دن ہمارے ساتھ گزارو نا۔ بہت انجوائے کرو گی اور شام کی پارٹی میں تو وہ ہمیں جوائن کر ہی لے گا۔ ہم۔۔۔ م۔۔۔ م۔" ان کا انداز ابھی بھی ویسا ہی پیار بھرا تھا۔ مگر اسے بے چینی نے آگھیرا۔

یہ گھر اور گھر کے لوگ، یہ ماحول سب ایک دم اجنبی اور پرایا لگنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں دو دن کے لیے شہر جا رہا ہوں۔"

"اور نو زریاب! یہ کیا بات ہوئی۔ تم اس دن بھی دروازے سے مجھے ڈراپ کر کے چلے گئے تھے۔"

اسے پتا تھا آئمہ ناراض ہو گی۔ لیکن اس کا کام زیادہ ضروری تھا۔

آج صبح آفس آتے ہی اسے خبر ملی تھی کہ کیمپ میں کل رات شاہل کے ساتھ کسی نے دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے شور مچانے پر سب سے پہلے اس کا ماما ہی وہاں پہنچا تھا۔ شاہل اسی وقت وہاں سے نکل کے اس کے آفس آ گئی تھی۔ اس نے پوری رات وہیں ٹھنڈے برآمدے کے یخ بستہ فرش پر بیٹھے بیٹھے گزار دی تھی۔

اسے یہ ساری معلومات فضل کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں۔ جو فجر کے وقت آفس کھولنے آیا تو اس نے شاہل کو برف جیسے فرش پر بیٹھے روتے ہوئے پایا۔ شاہل کا کہنا تھا کہ کیمپ میں اس کے ساتھ بدتمیزی کرنے والا شخص اس کے ماما کا ہی بھیجا ہوا تھا۔ اس کا ماما اسے خوف زدہ کر کے اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند کرنا چاہتا تھا۔

زریاب اس واقعے کی تفصیل سن کر اتنا ڈسٹرب ہوا کہ اس نے فوراً ہی اسے اپنے ساتھ ہی کراچی لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چونکہ یہ فیصلہ اس نے انتہائی ہنگامی بنیادوں پر کیا تھا۔ اس لیے نہ صرف آئمہ کو اس کے حصے کا سارا کام نپٹانا تھا۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ ایک خوب صورت سفر سے، اسی وجہ سے محروم رہ جانے والی تھی۔ وہ اس کی ناراضی کا سبب سمجھتا تھا، مگر مجبور تھا۔

مضافاتی علاقوں میں آباد گاؤں میں غربت کی لکیر اور خواندگی کی شرح پر کی جانے والی ریسرچ کی سروے رپورٹ اسے کل ہر حال میں فائنل کر کے دینی تھی،

اور کام اتنا زیادہ تھا کہ کل پر ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ جو مسئلہ ابھی اس کے سر پر پڑا تھا وہ بہرحال اپنی جگہ اہم تھا اور وہ ایک دن میں کراچی جا کے واپس نہیں آ سکتا تھا۔ آئمہ بھی یہ سب سمجھتی تھی۔ جب ہی اس نے ناراض تو تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔

"پلیز آئمہ۔۔۔ ڈونٹ بی اینگری، پلیز انڈر اسٹینڈ۔"

"آئی کین انڈر اسٹینڈ۔" اس نے جتایا۔ "دیکھو اگر یہ سروے رپورٹ کا مسئلہ نہیں ہوتا نا، تو میں تمہیں ضرور ساتھ لے کر چلتا۔ ایک تم ہی تو میری فرینڈ ہو اور تم جانتی ہو، میں تمہاری کمپنی کو ہمیشہ ہی انجوائے کرتا ہوں۔"

"اٹس اوکے، میں نہیں ہوں ناراض، مگر بس تم جلدی آ جانا۔" وہ مسکرا دی تھی۔

وہ جانتی تھی، زریاب جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ وہ واقعی اس کا بہت اچھا دوست تھا اور وہ خود بھی اس کی بہترین دوست تھی۔ اپنی اس دوستی کو چھوٹی بہن کے حوالے سے رشتے داری میں بدلنا چاہتی تھی۔

"اور سنو۔ میں رپورٹس ریڈی کر کے باس کو دے دوں گی۔" اس نے آواز لگائی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسکول میں اس کا پہلا دن توقع کے مطابق اچھا ہی گزرا تھا۔

پرنسپل کا انداز مشفقانہ تھا تو اسٹاف کا دوستانہ۔

یہ کوئی بہت بڑا انگلش میڈیم اسکول نہیں تھا۔ درمیانے درجے کا ایک معمولی سا تنگ گلیوں کے مقابلے میں کھلے میدان میں کھلنے والا اسکول تھا۔ میٹرک تک کلاسز تھیں اور انگلش بولنے پر کوئی خاص زور نہ تھا۔ بلکہ زیادہ تر ٹیچرز معمولی سی بھی انگلش بولنے سے قاصر تھیں۔

ایسے میں اس کے منہ سے نکلنے والے انگلش کے چھوٹے چھوٹے جملوں نے اسے اچانک ہی سب اسٹاف کی نظر میں بہت پڑھا لکھا بنا دیا تھا۔ وہ گئی بھی انگلش اور سائنس پڑھانے کے لیے تھی۔ اس لیے دوسرے مضامین کی ٹیچرز کے مقابلے میں اسے وہ امتیازی حیثیت پہلے دن ہی حاصل ہو گئی تھی جو سائنسی مضامین اور نہم اور دہم جماعت پڑھانے والے اساتذہ کو حاصل تھی۔ یہی امتیاز یہاں ٹیچرز کی تنخواہ میں بھی روا رکھا جاتا تھا۔

سارا دن ایک خوش کن احساس اس کے گرد چھایا رہا۔

چھٹی کے سے گھر کی طرف اٹھنے والے قدموں میں تھکاوٹ کے باوجود ایک نیا جوش و جذبہ جھلک رہا تھا۔ اسے یقین تھا، وہ اپنے شاگردوں میں بھی اپنے حسن سلوک کی بدولت جلد ہی مقبولیت حاصل کر لے گی۔ اسے یاد تھا۔ جب وہ میٹرک میں تھی تو اپنا خرچ خود اٹھانے کی خاطر ٹیوشنز دیا کرتی تھی۔ تب بھی بچے اس کو زریاب کی نسبت زیادہ پسند کرتے تھے۔ زریاب اور اس نے اکٹھے ہی تو ٹیوشن دینی شروع کی تھی اور زریاب۔۔۔؟

سبک خرامی سے اٹھتے قدموں میں پہلا بریکر آیا تھا۔

"یہ میں زریاب کو یاد کرنا کب چھوڑوں گی۔ اللہ جانے چھوڑ بھی سکوں گی یا ساری زندگی یادوں کے سہارے۔

او میرے خدا۔" دروازہ بجاتے ہوئے یہی آخری خیال آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ پریشان تھی۔ آدھی رات گزر چکی تھی اور پارٹی اپنے عروج پر تھی۔

اس کلاس میں پینا پلانا بڑی عام سی بات تھی۔ اسے شادی کے شروع کے دنوں میں اگر کبھی حیرت، پریشانی یا کراہیت ہوتی بھی تھی تو اب وہ سارے احساسات ایک سرد اور جامد کیفیت میں بدل چکے تھے۔ شادی ایک جوا ہے اور وہ جانتی تھی وہ یہ جوا بہت بری طرح ہار چکی ہے۔

تھوڑے دن غم منانے کے بعد اس نے یہ ہار قبول

مسکرادی تھی۔

لیکن دور، دور تک اسے پتا نہ تھا کہ وہ کیا کچھ ہار چکی ہے اور کیا کچھ ہے جو ابھی قبول کرنا باقی ہے۔ اس کا شوہر اسے ابھی تک لینے نہیں آیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ کم سے کم اسے لینے تو ہرگز نہیں۔

"ارے یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہو۔" مسز رباب بہت دیر بعد اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

"نہیں کچھ نہیں۔۔۔ بس وہ تھکن سی ہو رہی تھی۔" وہ شدید تھکن کا شکار تھی۔

"ارے ابھی سے تھکن ڈارلنگ، ڈونٹ وری میں ابھی تمہیں اندر بھجواتی ہوں، معین ادھر آؤ۔" انہوں نے پاس کھڑے ملازم کو آواز دی۔

"وہ بابر۔۔۔ نہیں آئے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔" وہ۔۔۔ چونک سی گئیں۔

"آجائے گا نا۔۔۔ کہیں پھنس گیا ہوگا، جانی تم پریشان مت ہو۔ تم میرے پاس ہو۔ بالکل اپنوں کے پاس۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کے بولیں۔

"اس کے ساتھ چلی جاؤ، بیگم صاحبہ کو ان کا بیڈ روم دکھاؤ۔"

وہ مصروف سے انداز میں کہہ کر کسی اور طرف بڑھ گئیں۔

اس کو اس طرح کی مخلوط محفلوں میں شرکت کرنے کی ابھی تک عادت نہیں پڑی تھی۔ وہ فوراً" ایسی بے باک محفل سے جان چھوٹنے پر شکر ادا کرتی۔ ملازم کے پیچھے چل دی۔ جہاں عریاں بازوؤں اور مختصر لباس والی عورتیں محرم اور نامحرم کا فرق بھولے۔ غیر مردوں کے گلے کا ہار بنی جا رہی تھیں۔ رنگین مشروب کے نشے میں ڈوبے سب ہی حال سے بے حال تھے۔

اور ایک نوکیلی سوچ جو مستقل اسے چبھ رہی تھی۔

"مسز رباب کو پتا تھا کہ بابر آج نہیں آئیں گے۔ جب ہی انہوں نے میرے لیے بیڈ روم تیار کروایا۔ مگر۔۔۔ وہ یہ بات مجھے بتا بھی تو سکتی تھیں کہ مجھے آج یہیں رکنا پڑے گا۔ چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔"

☼ ☼ ☼

کراچی آنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔

سورج سارا دن گزارنے کے بعد مغرب کی سمت سفر کر رہا تھا۔ مسلسل ڈرائیونگ سے اس کا جسم تھک کر چور ہو چکا تھا۔ یہاں اکیلے آنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فضل داد کو اس کے اگلے ٹھکانے کا علم ہو۔

"آج تمہیں میرے گھر میں رکنا ہوگا۔" وہ پیچھے سیٹ پر سکڑ کے بیٹھی شاہل سے مخاطب تھا۔

"گھر جاتے جاتے رات ہو جائے گی اور میں تھک بھی گیا ہوں بہت۔ کل چلیں گے وہاں۔ جہاں تمہیں کام مل جائے گا۔" وہ چپ تھی مگر وہ جانتا تھا وہ سن رہی ہے۔

"اچھا دیکھو، مجھے بھوک لگی ہے۔ میں کھانا لاتا ہوں۔ اگر تمہیں کچھ کھانا ہے تو بتادو۔"

اس نے حسب توقع نفی میں سر ہلایا۔ پھر بھی واپسی پر اس کے ہاتھوں میں اس کے لیے برگر اور کولڈ ڈرنک تھی۔

"کھالو، مجھے پتا ہے تم بھوکی ہو۔" اس نے جھجکتے ہوئے اپنے سانولے ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔

چیزیں تھماتے ہوئے دونوں کی انگلیاں ذرا مس ہوئیں تو زریاب کو ان ہاتھوں کی نرمی کا احساس ہولے سے چھو گیا اور ساتھ ہی کسی کی یاد بھی۔ وہ جانتا تھا۔ اب نہ یہ یاد ٹلے گی نہ اس کی جان چھوڑے گی۔

وہ اگلے کئی گھنٹوں تک جاگنے کے لیے بالکل تیار تھا اور اگلے کئی گھنٹوں تک کوئی قابل غور کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب اسے ڈرائیونگ پر پہلے سے زیادہ توجہ دینی تھی اور تھکاوٹ بڑھتی جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

کوئی موسم تو ایسا ہو
کہ جب بچھڑے ہوؤں کی یاد کے جگنو چمک کھو دیں

کوئی موسم تو ایسا ہو
کہ دل کے زخم بھر جائیں
اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر۔۔۔
ساری خواہشیں دل کی
سارے خواب اور ارماں
یوں ہی گھٹ گھٹ کے مرجائیں، مجھے آزاد کر جائیں
کوئی موسم تو ایسا ہو
کہ جو موسم، تمہاری یاد کا موسم نہ ہو

اسکول کی مصروفیت میں دن رات کی سست رفتار نے قدرے تیزی پکڑی تھی۔ وہ اپنے نئے معمول سے مطمئن تھی۔

مستقبل قریب میں اس کا ارادہ تھا کہ وہ گھر پہ بھی ٹیوشنز شروع کردے گی۔

دل ودماغ کی مصروفیت اس سے بہتر اور کوئی نہیں تھی کہ کسی تعمیری کام میں لگایا جاتا۔ یہ الگ بات تھی کہ صبح صبح نوکری کے لیے گھر سے نکلنا اور پھر واپسی پر تمام کام نمٹانا اس کی تھکاوٹ میں کئی گنا اضافہ کرتا تھا۔ لیکن یہ مصروفیت تکلیف دہ یادوں سے پیچھا چھڑانے میں بہت مددومعاون تھی۔

یادیں جو کسی تار عنکبوت کی طرح اس کے گرد اپنا جال کستی جاتی تھیں۔ وہ اپنا آپ چھڑاتے چھڑاتے ہلکان ہونے لگی تھی۔ بھلا اور کون سی خوش بختی زریاب کے سوا اس کی زندگی میں اس کی منتظر تھی۔

کچھ بھی تو نہیں تھا۔ نہ لاڈ اٹھانے والے ماں، باپ، نہ پیار بھری لڑائی کرنے والے بہن، بھائی۔ ایک بہن تھی تو اس نے اپنا بہناپا خوب دکھایا اور چچی۔۔۔ جنہیں وہ ماں سمجھتی تھی۔

دراصل وہ اس کی ماں تھیں ہی نہیں۔ نہ سگی، نہ سوتیلی وہ اس کے رشتے کی چاچی تھیں۔

اپنی پیدائش پر ہی ماں جیسی انمول ہستی سے محروم ہوجانے کے بعد۔ اسی گھر میں کھیلی کودی، وہ ان ہی کو ماں سمجھتی چلی آرہی تھی۔ ہمیشہ سے۔ ان کی اکلوتی اولاد نعیمہ عرف نمو ہی اس کی اکلوتی بہن تھی۔

ہاں زریاب کی بات الگ تھی۔ اسے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے سے اس گھر میں آتے اور اپنا خیال رکھتے دیکھا تھا بہت سالوں تک۔ وہ فطرتاً" بھی ایسا ہی تھا۔ محبت، مروت، فکر پروا کرنے والا، خیال رکھنے والا۔

لیکن وہ خاص نرم گرم جذبے جو کسی خاص شخص کے لیے دل میں ابھرتے ہیں۔ اس کا اظہار اس نے صرف رشنا سے ہی کیا تھا۔ اس میں کسی اور کو بھی شراکت دار نہیں بنایا نہ، اس نے نہ رشنا نے۔ پھر بھی پتا نہیں کب، کیوں اور کیسے نمو کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا اور اس نے اس راز میں سب سے پہلے اپنی ماں کو شریک کیا۔ کہنے کو تو زریاب، رشنا کی خالہ کا بیٹا تھا اور اسی کی وجہ سے اس گھر میں آتا تھا۔ لیکن نمو اس کی آمد کو اپنے آپ سے منسوب کرکے اس کی راہ تکنے لگی۔

رشنا کو احساس تک نہ ہوا کہ کتنی بڑی شکست اس کی سجی سجائی، سیدھی سادی زندگی کی بساط الٹنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔

"چچی! میرے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ تمہاری تعلیم کب مکمل ہوگی۔ کب تم نوکری کرو گے۔" اس کے لہجے اور آواز میں مایوسی تھی۔

"اس کے لیے میری تعلیم اور نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ میں آج ہی بات کرلیتا ہوں۔"

"پاگل ہو گیا۔ جب تک نوکری نہیں کرلیتے کس بل بوتے پر کہہ سکتے ہو۔"

"مجھے اپنے زور بازو پہ پورا بھروسا ہے یار۔"

"وہ تو سب کو ہے۔ خدانخواستہ کوئی تمہیں ناکارہ تو نہیں کہہ رہا، لیکن تمہارے لیے شادی کی بات جلدی ہے۔"

"اور تمہارے لیے یہ جلدی نہیں ہے۔ تم مجھ سے کتنی چھوٹی ہو۔"

"ہاں تو لڑکیوں کی شادی کم عمر میں ہوتی ہے۔ انہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا انتظار نہیں ہوتا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"تمہاری چچی جانتی ہیں، میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تمہارے لیے یہاں آتا ہوں۔ پھر وہ کیوں یہ سب چکر چلا رہی ہیں۔"

"پتا نہیں۔" وہ خود الجھی ہوئی تھی۔ "ابو کے جانے کے بعد ہم تینوں بہت اکیلی سی ہو گئی ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے، مجھے بات کرنے دو۔ ان کی فکر کم ہو جائے گی۔ کہہ دوں گا آپ نمو کی فکر کریں۔ تمہاری فکریں میرے لیے چھوڑ دیں۔"

وہ بات کے آخر میں نرم نگاہوں میں اس کا صاف ستھرا چہرہ سمو کر مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

نیم تاریک کمرے میں بیٹھے ہوئے اسے یاد نہیں تھا اسے۔ کتنی دیر ہو گئی تھی آنسو بہاتے ہوئے۔

کیا ہوا تھا۔ یا کیا ہو رہا تھا یا کیا ہونے والا تھا اس کے ساتھ، لاکھ چاہنے پر بھی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ فقط چھ مہینے پہلے اسے بیاہ کر لانے والا شوہر چھ ماہ میں چھ بار بھی اس کے گھر والوں سے ملانے نہیں لے کر گیا۔ اس کے گھر میں فون نہیں تھا۔ موبائل کی سہولت تو خیر عیاشی ہی تھی۔ وہ فقط تین بار اپنے پڑوس میں فون کر کے امی سے بات کر سکی تھی۔ ایک بار انہیں وے کا اٹیک ہوا تو وہ اس قابل نہیں تھیں کہ گھر سے نکل کر اس سے بات کرنے پڑوس تک آپاتیں۔

پھر ایک دن اس کی کسی بات پر چراغ پا ہو کر بابر سلطان نے حکم جاری کیا کہ آئندہ وہ ماں سے ملنے نہیں جائے گی۔ اس نے احتجاج کیا تو سنگین نتائج کی دھمکی، دو، چار طمانچوں کے بعد مل گئی۔ اس نے بھی زبان بند کر لی۔ اتنی عقل تو تھی اسے کہ لوئر کلاس سے ڈائریکٹ اپر کلاس میں ایک لمبی چھلانگ محض چند دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لیے مارنے کے نتیجے میں اسے جن چیزوں سے ہاتھ دھونے پڑے اس میں اس کی ماں بھی شامل تھی۔

اسے غم تو بہت زیادہ تھا، لیکن بہت جلد غلط کرنا پڑا۔

بابر سلطان کے وحشیانہ رویے سے ڈر کے، یا آنے والی زندگی کی رنگینیوں کا سوچ کے۔ اسے اس زندگی کا استقبال کرنا ہی تھا۔ جو بانہیں کھولے اس کی منتظر تھی۔

اور اس نے کیا بھی، خود کو اس ماحول میں جذب کرنے کی پوری پوری کوشش کی جو اس کی پچھلی زندگی سے اعشاریہ صفر صفر ایک فیصد بھی میل نہیں کھاتا تھا۔ اس کے لیے تو وہ جگہ، وہ محل نما گھر ہی کسی ونڈر لینڈ سے کم نہ تھا۔ اسے تو وہاں کی ٹونٹیوں اور دروازوں کو کھولنے اور بند کرنے کے طریقے بھی دوسرے ملازموں نے سکھائے تھے اور اب جبکہ وہ وہاں کی محفلیں اٹینڈ کرنے اور مہمانوں کو کسی حد تک خوش کرنے کے بھی قابل ہو گئی تھی تو.....

ایک نیا دن، نیا موڑ اور نیا انتظار اس کی راہ میں کھڑا تھا۔

تین دن گزر چکے تھے اسے۔ ایک اور ونڈر لینڈ بلکہ مسٹری لینڈ کی سیر کرتے ہوئے۔

یہاں کی لینڈ لیڈی نے اسے شہزادیوں کی سی آن بان کے ساتھ ماتھے پر ایک بھی بل ڈالے بغیر رکھا ہوا تھا۔ بابر سلطان کہاں تھا۔ اب تک کیوں نہیں آیا تھا اور کب آنا تھا اسے، کچھ بھی علم نہ تھا۔ معمولی سی تشویش، ٹھیک ٹھاک پریشانی میں بدل چکی تھی۔ مسز رباب جنہیں وہ بھی دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی، آنٹی بلانے لگی تھی۔ کوئی بھی تسلی بخش جواب دینے میں ناکام رہی تھیں۔ موبائل استعمال کرنا اسے آتا ہی نہ تھا۔ نہ بابر سلطان نے کبھی اسے موبائل دلایا۔ نہ اس نے ضرورت محسوس کی۔ وہ اس وقت سخت بے بسی سے نبرد آزما اس کا انتظار کرنے پر مجبور تھی۔

☼ ☼ ☼

رات اتنی طویل نہیں تھی۔ جتنی اس کے لیے بن گئی تھی۔

ماضی کی سنہری، رنگین اور زہریلی یادیں، اپنے نوکیلے پنجے اس کے دماغ میں گاڑے، دل میں کھونپے

قطرہ قطرہ اس کی نیند چوستی رہی تھیں۔

اور وہ مجبور تھا اسے یاد کرنے پر۔ جس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔ جس کے سنگ ہر خوشی، ہر غم کا سامنا کیا تھا۔

"روشی، رشنا میری جان، سوری، آئی ایم سوری۔"

الفاظ اس کے لبوں سے ٹوٹ کر بے آواز فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ انگلیوں میں دبا سگریٹ جلتے جلتے پوروں تک آن پہنچا تو احساس ہوا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے اسے سوچ رہا تھا۔ سگریٹ، ایش ٹرے میں مسل کر جلتی آنکھوں کو دھیرے سے رگڑا۔

اسی پل دروازہ کھول کر کسی نے اسے پکارا تھا۔

"بھائی!" اس نے پلٹ کر دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"بھائی! آپ آئے آپ۔" دروازے سے آگے بڑھ کر وہ بے تابانہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

"بہت دیر ہو گئی تم کہیں باہر گئی ہوئی تھیں۔"

"ہاں وہ آج۔" وہ کچھ رک کر بولی۔ "تمہاری ویڈنگ اینورسری تھی آج۔"

"اور رابی سویٹو! تم خوش ہونا اپنے ہبی کے ساتھ، انجوائے کیا ڈنر۔" اس نے برابر میں بیٹھ کر اس کے شانے پر بازو نکالیا۔

"تو سمجھ لو میں بھی بہت خوش ہوں۔ میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"آپ کو نہیں، لیکن ہمیں پڑتا ہے۔ ہمیں فیل ہوتا ہے، مجھے اور آپی کو۔"

"ہاں۔۔۔ لیے۔۔۔ سمعیہ کیسی ہے۔" رابعہ جواب دیے بنا اسے دیکھتی رہی۔

اس کے خوب صورت چہرے پر مسلسل جگارے تھکاوٹ ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ پڑتے حلقے، گندمی رنگت سے میل نہیں کھا رہے تھے۔ مضبوط ہاتھوں کی نرم جلد بھی کھردری ہو چلی تھی۔ وہ بدل گیا تھا، بکھر گیا تھا اور کوئی سمیٹنے والا نہیں تھا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کرتے بھائی۔" اس کی بات غیر متوقع تھی۔ مگر نہ نئی تھی، نہ انوکھی۔ اس کا ہاتھ بے ارادہ رابی کے شانوں سے پھسل کر اپنی گود میں آگرا۔

"بھائی! آپ بھول کیوں نہیں جاتے ان کو۔"

جواب ندارد۔

"اگر خالہ جان یا ہمارے والدین میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہوتا تو، یہ سب اس طرح نہ ہوتا، جس طرح ہوا۔"

"ہاں شاید تب کسی اور طرح ہوتا۔" اس کی آواز مضمحل تھی۔

"ہاں نا۔۔۔ تب شاید کوئی آپ کو اتنا آگے نہ بڑھنے دیتا۔ شروع میں ہی روک دیتا۔" اس کی گود میں دھری ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھ گئیں۔

"اب ایک بات جو ممکن ہی نہیں ہے، کیا آپ ساری زندگی اسے۔۔۔"

"رابعہ پلیز۔۔۔ میں اس ٹاپک پہ بات نہیں کر سکتا۔" وہ اٹھ کر وارڈروب کے پاس چلا گیا۔

"بات کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔"

"کر نہیں سکتا اور پلیز مجھ سے اصرار مت کرو میں مجبور ہوں بہت اس معاملے میں۔"

رابعہ یہ بات سمجھتی تھی۔ وہ صرف منہ چھپانے کی خاطر وارڈروب میں گھسا کھڑا تھا۔

"صرف اسی معاملے میں بے بس نا اور یہ بے بسی آپ کی طاری کی ہوئی ہے۔ کیوں نہیں سامنا کرتے حقیقت کا۔ ایک بار اعتراف کریں کہ ہاں آپ غلط تھے۔ انجانے میں سہی، لیکن۔۔۔"

"رابعہ۔۔۔" وہ اتنی زور سے چلایا تھا کہ رابعہ نہ صرف سہم کر چپ ہو گئی تھی۔ بلکہ اٹھ کر کھڑی بھی ہو گئی تھی۔

"ہزار بار منع کر چکا ہوں۔ تم کیوں ہر بار یہ تکلیف دہ بات شروع کر دیتی ہو، کیوں۔" اب کی بار وہ تیزی سے پلٹ کے اس کے سامنے آیا۔

"نہیں دینا چاہتیں نا تکلیف مجھے، بچانا چاہتی ہو نا اذیت سے۔ تو آئندہ کبھی بھی میرے سامنے اس کا ذکر

مت کرنا۔" اس نے رابعہ کے دبوچے ہوئے بازو بری طرح جھنجھوڑ ڈالے۔ رابعہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔

"آئی ایم سوری۔"

زریاب کو فوراً ہی اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو گیا۔

اگلے ہی پل اس نے اس کے بازو چھوڑ کے پیشانی پر بوسہ دے کر سینے سے لگا لیا تھا۔ رابعہ کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو اس کے فراخ سینے میں جذب ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت انہماک سے سبزی کاٹنے میں مصروف تھی۔ چولہے پر چائے چڑھی تھی۔ آج بہت عرصے بعد اس نے دل سے کھانا پکانے کا سوچا تھا۔

گلی سے سبزی والا گزرا تو اس نے دوڑ کر بینگن، آلو، پیاز اور اس جیسی دو، تین سبزیاں اکٹھے خریدیں۔ گوشت تو خیر صرف بقرعید پر ہی ملتا تھا۔ اگر آس پڑوس سے آجائے تو، لیکن اب وہ اتنی گئی گزری حالت میں نہیں تھی کہ چند ایک سبزیاں بھی نہ خرید پاتی۔

بڑھتی ہوئی سردی کی شدت اور اس کے کپڑوں اور جوتوں کی خستہ حالی کو دیکھتے ہوئے ایک ہمدرد دل رکھنے والی کولیگ نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے اس کی مالی مدد کرنے کی کوشش کی تھی اور اسے اس کے ہاتھ سے پیسے پکڑتے ہوئے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ خودداری اور عزت نفس کی پامالی، کیسے کچوکے لگاتی ہے۔ انسان کسی کے سامنے اف تک نہیں کر سکتا۔

اس کی پلکیں جھک گئی تھیں، مگر لب انکار سے انکاری۔

"دیکھو، میں جانتی ہوں تم مجھے ابھی اتنی گہری دوست نہیں سمجھتیں کہ مجھ سے اس طرح رقم لے لو۔ مگر یقین کرو، میں تمہیں کبھی احساس نہیں دلاؤں گی کہ میں نے زندگی میں کبھی تمہیں کچھ بھی دیا تھا اور اگر تم چاہو تو ادھار سمجھ کر رکھ لو۔ سیلری ملے تو واپس کر دینا۔ مگر پلیز اپنے لیے نئے شوز لے لو ابھی، نہیں تو تمہارے پیروں کا حشر ہو جائے گا۔" اس کا خلوص اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔

وہ تو صرف اسے شوز لینے کا کہہ رہی تھی۔ مگر رشنا جانتی تھی۔ صرف شوز خریدنے کی مد میں دی جانے والی رقم اتنی تھی کہ وہ اس سے اپنی بہت سی ضروریات پوری کر سکتی تھی۔

دودھ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے تین دن سے ایک کپ چائے تک نہیں پی تھی۔ دالوں کے ڈبے خالی تھے اور سبزی کی ٹوکری اجڑ چکی تھی۔

اس نے ایک گہری سانس بھر کے وہ پیسے اپنے خستہ حال بیگ میں ڈال لیے۔ جس کی زپ اس نے کل ہی پلاس سے دبا کے ٹھیک کی تھی اور جس کی اندرونی جیبیں ادھڑ چکی تھیں۔

سوچوں میں ڈوبے کپ میں چائے انڈیلتے اسے کسی غیر معمولی احساس نے چھوا تھا۔ اس نے یوں ہی پلٹ کر کمرے میں نظر ڈالی اور چائے کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

چچی بے تابی سے ہاتھ پٹختی اسے پکار رہی تھیں۔ ان کے منہ سے ڈھنگ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ جانے کب سے ان کو اٹیک ہوا تھا۔ اپنی سوچوں میں گم ہو کر اسے پتا تک نہ چلا۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول کر اس نے ہاتھ مارا۔ خدا جانے ان ہیلر کہاں پڑا تھا۔ چچی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بری طرح سانس کھینچ رہی تھیں، تڑپ رہی تھیں۔

"یا اللہ کہاں چلا گیا۔" کارنس پر رکھا سامان الٹ پلٹ کرتے وہ بے طرح رو دی۔

جب ہی آنسوؤں کی دھند کے پار اسے دور زمین پر بے یار و مددگار کھلونے کی طرح پڑا ان ہیلر نظر آیا۔ اس نے تیر کی طرح لپک کر ان ہیلر اٹھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اوہ۔۔۔ زریاب! کیسے ہو تم۔" حسب توقع رباب آنٹی اسے دیکھ کے خوش ہو گئی تھیں۔

"کتنے دن بعد شکل دکھائی ہے تم نے۔ لگتا ہے ہمیں بھول ہی گئے۔" وہ ان کے اپنائیت بھرے شکوے کے جواب میں بس مسکرا دیا۔

"یہ کون ہے۔" ان کی نظر کونے میں بیٹھی لڑکی پر پڑ چکی تھی۔ ان کا چونکنا بڑا فطری سا تھا۔

"یہ بے سہارا لڑکی ہے، اسے کام چاہیے۔ آپ کو میڈ کی ضرورت تھی نا۔ آپ نے ذکر کیا تھا مجھ سے۔" انہیں یاد آچکا تھا۔ "تو تم اسے لے کر آئے ہو۔"

"بس مجھے ٹھیک لگی، ایکچوئیلی اس کے گھر والے تو ہیں نہیں۔ میں نے سوچا، آپ کے پاس رہ بھی لے گی اور آپ کا پرابلم بھی سولو ہو جائے گا۔ شاہل ہے اس کا نام۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے معین!" ان کا ذاتی ملازم دروازے کے باہر ہی کھڑا تھا۔ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

"اسے رسولن کے پاس لے جاؤ۔ کچن وغیرہ کا کام کرے گی اور اب یہیں رہے گی۔" وہ مودب سی معین کے پیچھے باہر نکلنے لگی۔

"کوئی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ آنٹی تمہارا بہت خیال رکھیں گی۔ میں بھی آتا رہوں گا۔" زریاب نے بات مکمل کر کے اسے دیکھا۔ وہ سر ہلا کر ہاتھ جوڑتی باہر نکل گئی۔

مسز رباب نے بہت دھیان سے اس کی تسلی کا نوٹس لیا تھا۔ بے سہارا غریب اور جوان لڑکیوں سے انہیں بہت رغبت تھی اور پھر ایسی لڑکی جوان کا پسندیدہ شخص ان کے پاس لایا تھا۔ وہ زریاب کو بہت پسند کرتی تھیں۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو کر جب وہ موت کے بالکل دہانے پر پہنچ چکی تھیں تو زریاب نے ہی ان کو ہاسپٹل پہنچایا تھا۔

یہ سالوں پہلے کا واقعہ تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد جب انہیں زریاب کا پتا چلا تو انہوں نے محض اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنے پاس بلایا تھا۔ لیکن اس کے حالات اور اکیلے پن کی بابت جان کر نہ صرف اسے ماہانہ اخراجات کے لیے رقم بطور ادھار مخصوص کر دی تھی، بلکہ تعلیمی اخراجات بھی اپنے ذمے لے لیے تھے۔

زریاب ان دنوں رشنا سے ناتا ٹوٹ جانے کے بعد بالکل مضمحل ہو کے رہ گیا تھا۔ وسائل کی کمی نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر رکھا تھا۔ تو دل ٹوٹ جانے کے بعد روزگار کا سلسلہ بھی بحالت مجبوری جیسے تیسے جاری رکھا تھا۔ مسز رباب کی حوصلہ افزائی سے اس نے ایک نئے عزم و عہد کے ساتھ دوبارہ ایڈمیشن لیا۔ گریجویشن کے بعد انہوں نے ہی اس کو جاب دلوائی تھی اور اس سے چھوٹی دونوں بہنوں کی شادیوں کے سلسلے میں بھی اس کی بہت مدد کی تھی۔

ان کے بقول زریاب نے ان کی جان بچا کر ان کو ساری زندگی کے لیے اپنا احسان مند کر لیا تھا اور جواب میں انہوں نے زریاب پر جو احسانات کی بارش کی تھی۔ وہ ساری زندگی نہیں چکا سکتا تھا۔ یہ زریاب کا خیال تھا۔

صاف ستھرے بزنس کی آڑ میں سیاہ پیشہ کرنے والی مسز رباب کی شخصیت میں اگر کوئی انسانیت کا پہلو تھا تو صرف یہ کہ وہ اپنے ملازموں کے ساتھ بہت اچھی تھیں، اور زریاب پر ان کی خاص نظر کرم بھی تھی۔ جس نے انہیں ایکسیڈنٹ کے بعد بروقت ہاسپٹل پہنچایا تھا۔

"چلو اگر تم بزی نہیں ہو تو میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"کچھ شاپنگ کرنی ہے، تم سے گپ شپ بھی ہو جائے گی۔"

"چلیں۔۔۔ میں بھی رابی کے لیے گفٹ لے لوں گا۔ کل اس کی ویڈنگ اینورسری تھی۔" وہ مسکرا دیا۔

"اچھا۔۔۔ کیسی ہیں سسٹرز تمہاری، چلو باقی باتیں راستے میں کریں گے۔ اور سناؤ۔ ارے ناشتا کر لیا تم نے یا ایسا کریں گے پہلے کچھ کھا پی لیں گے۔ میں نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے اور شاپنگ سینٹرز اتنی جلدی کہاں کھلتے ہیں۔" وہ باتیں کرتی اس کے ساتھ باہر کی

سمیت بیٹھ گئیں۔

✲ ✲ ✲

جانے کتنی دیر گزری تھی۔ کتنے گھنٹوں تک وہ سوئی تھی۔ کوئی اسے جگانے بھی نہیں آیا۔ اس نے مندی آنکھیں جھپک جھپک کر ٹائم دیکھا۔

"ارے بارہ بج گئے۔" وہ حیرت زدہ سی اٹھ بیٹھی۔

بڑی بڑی کھڑکیوں پر پڑے بھاری نفیس پردوں کے باعث وقت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ دن میں بھی رات کا سماں تھا۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا۔ وہ اٹھ کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس گئی اور پردے سمیٹ دیے۔ نرم ملائم، سرما کی دھوپ کمرے میں بھری تو حدت اور تازگی کا ایک الگ سا احساس ہوا۔ اتنا سو کر بھی جسم ست اور سر بھاری لگ رہا تھا۔

شاید یہ رات بھر رونے کا اثر ہے۔

رات کے ذکر کے ساتھ ہی اسے اپنی پریشانی یاد آگئی اور رباب سلطان بھی۔

اس نے واش روم میں جا کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور مسز رباب سے بات کرنے کمرے سے نکل آئی۔ "یہ کیا چکر چلایا ہوا ہے دونوں نے مل کر۔ بابر کب آئیں گے۔ میں اپنے گھر کب جاؤں گی۔" گزرتے وقت کے ساتھ اس کی فکر بھی بڑھ رہی تھی۔

"بڑی بی بی تو نہیں ہیں۔ کوئی صاحب آئے تھے۔ ان کے ساتھ باہر گئی ہیں۔" اس کے جوش پر پانی پھر گیا۔

"آپ ناشتا یہیں کریں گی یا کمرے میں؟" وہ وہیں کھڑے کھڑے ایک دم ہی کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ ملازمہ نے دوسری بار اسے آواز دی۔

"ناشتا کمرے میں لے آؤں جی۔"

"ہاں۔۔۔ کمرے میں۔۔۔" بے ربط انداز میں بولتی وہ، واپس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرہ ویسا ہی تھا سجا سجایا اور خاموش، لیکن اس وقت اسے کسی جیل سے کم نہیں لگا۔ ملازمہ ناشتا رکھ کے جا چکی تھی۔ لیکن اس کی توجہ ناشتے پر نہیں۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے لفافے کی طرف تھی۔ اس نے لفافہ اٹھاتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی کہ رات میں یہ لفافہ یہاں تھا یا نہیں۔

"یقیناً" نہیں۔ ورنہ اسے نظر آچکا ہوتا۔"

اسے کھول کر اندر موجود کاغذات نکالتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس میں صرف کاغذات نہیں۔ ایٹم بم ہے۔ وہ طلاق نامہ تھا۔ جو ایک دھماکے سے اس کے وجود کے پرخچے اڑا گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

چچی پر سکون ہو چکی تھیں۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کے وہیں ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ چچی نڈھال سی مسہری پر سر ڈالے پڑی تھیں۔ ناہموار تیز نفس کی آوازیں اس کے اپنے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بے بسی کے شدید احساس تلے اس کی آنکھیں چھت کو چھوتی زمین تک آئیں اور آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ایک پل میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مسہری پر پڑے تھکے ماندے وجود نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"اب کیوں رو رہی ہے۔ اب ٹھیک ہوں میں چل چپ ہو جا۔" پھولی سانسوں کے بیچ وہ رک رک کر بات مکمل کر پائیں۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ بدستور روتی رہی۔

"ارے کیا ہو گیا ہے آج تجھے۔ پاگل ہو گئی ہے کیا۔"

"ہاں، پاگل ہو گئی ہوں میں۔" وہ روتے روتے سر اٹھا کے چلائی۔ "اور مجھے پاگل کرنے والی ہیں آپ۔"

"میں۔۔۔ لو میں نے کیا کیا ہے۔"

"آپ نے مجھے اکیلا کر دیا۔ بے سہارا کر دیا ہے مجھے۔ زریاب کو چھین لیا آپ نے مجھ سے۔ آپ نے ہی کہا تھا اس سے کچھ۔ مجھے یقین ہے۔ اسی لیے وہ پلٹ کر نہیں آیا۔ سب کیا دھرا آپ کا ہے۔" اس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔ کتنے دنوں سے منہ بند آتش فشاں آج پھٹ پڑا تھا۔

"کبھی میری ماں بن کے نہیں سوچا۔ ہر جگہ، ہر بار اپنی بیٹی کو مجھ پر فوقیت دی۔ اب اگر آج آپ کو کچھ ہو گیا تو کیا بنے گا میرا۔ کہاں جاؤں گی میں، کیا کروں گی، کبھی سوچا ہے آپ نے؟" دل کے کسی کونے میں سر جھکا کے بیٹھا خوف اٹھ کے باہر آیا تھا۔

"اور جو تو بھی چلی جاتی مجھے چھوڑ کے تو۔۔۔ میں تو۔۔۔" چچی کی کمزور آواز کمرے کے سناٹے کو بے ربط کر گئی۔

"تو یہاں بھی اپنا ہی سوچا نا، میرا تو نہیں۔"

"تو۔۔۔ تو کون سا سوچتی میرے بارے میں۔ چلی جاتی اس کے سنگ مجھے چھوڑ کے یہاں۔ ارے جب میری سگی اولاد نے میری خبر نہیں لی تو تو کہاں رکتی۔"

"میں رک جاتی امی! میں کہاں جاتی آپ کو چھوڑ کے۔" اس کی آواز اور آنسو دونوں ہی دھیمے پڑ گئے تھے۔ "ساری زندگی اولاد کی طرح پالا۔ لیکن اولاد نہیں سمجھا۔ جب ہی تو کبھی بھروسا نہیں کیا میرے اوپر۔" اس کی آواز اب خود کلامی میں ڈھل رہی تھی۔

"کچھ بھی ہو۔ لیکن آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ سر جھٹک کر آنسو پونچھتی دوبارہ سے کچن میں چلی گئی۔ چولہے پر چائے چڑھاتے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

تمہارے بعد کیسی رونقیں اس دل کی نگری میں
سب ہی چراغ مدھم ہیں، کبھی ملنے چلے آؤ

تمہاری یاد اب دل کو بہت تکلیف دیتی ہے
نگاہیں بھی تو پرنم ہیں، کبھی ملنے چلے آؤ

✲ ✲ ✲

رابعہ کے لیے رباب آنٹی نے ایک خوب صورت جیولری سیٹ خرید کے دیا تھا۔ وہ خود بھی رابعہ کے لیے اور اس کے ہسبینڈ کے لیے سوٹ لے چکا تھا۔ اس کے بہت منع کرنے کے باوجود جب وہ نہ مانیں تو اسے لینا ہی پڑا۔ وہ ان کا بے حد ممنون تھا۔

شاپنگ سے پہلے انہوں نے اسے ایک عمدہ ریسٹورنٹ سے ناشتا بھی کروایا۔ اصل میں بھوک تو خود ان ہی کو لگی تھی۔ مگر زریاب بھی خوش گوار موڈ میں ان کا ساتھ دیتا رہا۔

شاپنگ سے واپسی پر اس کا موڈ رات کی نسبت بہت بہتر تھا۔ رابعہ کو اس کے گفٹس دیتے سے اس نے اس کے چہرے پر خوشیوں کے جو رنگ بکھرے دیکھے، دل میں بہت گہرائی تک اطمینان کروٹیں لینے لگا۔

ایک وقت وہ تھا جب وہ ایک ایک روپیہ دانتوں سے پکڑ کے خرچ کرتا تھا۔ ماں اور بہنوں کی تو کیا، اپنی ضرورتوں سے بھی آنکھیں چراتا تھا۔ ان کے ساتھ مل بیٹھنے سے گریز کرتا تھا۔ ان کی سوال کرتی نگاہوں کا سامنا کرنا اس کے لیے مشکل سے مشکل ترین ہو جاتا۔ اس کی ماں، حالات بدلنے اور بہتری آنے کے خواب دیکھتی، اپنی بیٹیوں کے گھر بسانے کے ادھورے سپنے لیے اس دنیا سے چلی گئی اور وہ بے بسی سے دیکھتا رہا۔ ادھوری تعلیم اور ناکافی وسائل کے ساتھ کوئی اسے نوکری دینے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔

جہاں تعلیم ضروری نہ تھی، وہاں ہنر کی قدر تھی۔ جہاں ہنر نہیں چاہیے تھا۔ وہاں تعلیم کی مانگ اور جہاں ہنر اور تعلیم دونوں ہی کی شرط نہ تھی وہاں کنونیس ایک ایسی شرط تھی۔ جس پہ آکے وہ ہار جاتا تھا۔

اس کی تو ذاتی سائیکل خریدنے کی اوقات نہیں تھی تو بائیک کی شرط کہاں سے پوری کرتا۔ جب مسز رباب کی مہربانی سے اس کی پہلی جاب لگی تو وہ اس وقت ایک مکمل گریجویٹ بھی نہیں تھا گریجویشن مکمل ہوتے ہی زندگی میں پہلی بڑی خوش گوار تبدیلی، کمپنی سے ملنے والا وہ اسی گز کا فلیٹ اور آٹھ سو سی سی کار تھی۔ جو کچھ مسز رباب کی سفارش اور کچھ اس کی اپنی دن رات کی محنت سے بنائی گئی ریپوٹیشن کا ثمر تھا۔

کمپنی کے جی ایم محنتی لوگوں کو پسند کرتے تھے۔ زریاب کے کام سے مطمئن تھے اور اپنے اطمینان کا اظہار انہوں نے بارہا زریاب کے سامنے بھی کیا۔ ان کی حوصلہ افزائی اور مسلسل محنت نے یہ دن دکھائے تھے کہ آج وہ اسی گز کے بجائے دو سو اسی گز کے ذاتی

گھر اور آٹھ سو سی سی کی ذاتی گاڑی کا مالک تھا۔

ایم بی اے مکمل کرتے ہی اس نے اپنی کمپنی کو خیرباد کہہ کر یہ این جی او جوائن کرلی تھی۔

وہ اپنے رب کا جتنا بھی شکر گزار ہو تا کم تھا۔

جس نے ایسے وقت میں اس کا ہاتھ تھاما جب وہ زندگی میں ہر شے سے مایوس ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

بہتے آنسو' رخساروں پر ثبت انگلیوں کے ابھرے نشانوں سے پھسلتے اس کی جلن میں کئی گنا اضافہ کر رہے تھے۔ اس کے جبڑوں میں اب بھی دکھن باقی تھی۔

اور یہ جلن اور دکھن اس مزاحمت کا نتیجہ تھی۔ جو مسز رباب کے میٹھے لہجے کا بھید کھل جانے پر اس نے کی تھی۔

بدگمانی اور وسوسوں کی آخری حد پہ جا کے بھی اس نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔ جو اس کے ساتھ یہاں ہو گیا تھا۔ اس کا شوہر بدکردار تھا۔ وہ چپ چاپ سہہ گئی۔ شرابی تھا' زانی بھی تھا' اس نے برداشت کرلیا۔ اسے اپنے کردار کو بچانا تھا۔ اپنے آپ کو صاف رکھنا تھا۔ لیکن یہ سب کیسے ہو گیا جو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اس کا شوہر' اس کا شوہر تھا ہی نہیں۔ اس کا نکاح صرف ایک ایگریمنٹ تھا۔ ایک معاہدہ باعزت اور قانونی اغوا کی طرح۔ بلکہ بقول مسز رباب' چھ مہینے اسے اپنے نکاح میں رکھ کے اس نے صرف ایک کاغذ کے بل بوتے پر اتنے دن مفت میں مزے لوٹے تھے۔ اب ان کی باری تھی اور انہیں اس پروجیکٹ میں لگایا گیا تمام سرمایہ سود سمیت وصول کرنا تھا اور کیسے وصول کرنا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ پیسے کے لالچ میں اپنی سے دگنی عمر کے آدمی سے نکاح کرتے وقت اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ فقط چھ مہینے میں اس کا دل بھر جائے گا اور وہ اپنی ہی عزت کی دلالی پر اتر آئے گا۔

ایک بدچلن' بدکردار' سیاہ کاری کرنے والی عورت کے ہاتھوں اسے بیچ کر چلا جائے گا۔ کہ خود اسے کانوں کان بھی خبر نہ ہو گی۔

☼ ☼ ☼

وہی کمرہ تھا آراستہ پیراستہ۔ جو ذرا دیر پہلے اسے جیل لگ رہا تھا۔ اب تو جہنم کی مانند دہک اٹھا۔ آنسو بے آواز آنکھوں سے نکل کے بہتے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

طلاق کے کاغذات اب اس کے پاس نہیں تھے۔ وہ مسز رباب کے قبضے میں جا چکے تھے۔ اس نے اپنے خالی ہاتھ دیکھے۔ اسے لگ رہا تھا اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ مسز رباب صرف کاغذات پر نہیں' ہر چیز پر قابض ہو چکی تھیں۔ اس کی زندگی' وجود' خوشیاں یہاں تک کہ آتی جاتی سانسوں پر بھی۔

"کیا ہو گیا' یہ سب کیا ہو گیا' او میرے خدا' مجھے بچا لے' میرے مالک' میں کہاں آگئی ہوں۔ یہ کہاں پھنس گئی ہوں میں۔"

خود کلامی کرتے دونوں ہاتھ سر پہ رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سردیوں کے موسم میں اسکول کی واپسی کے وقت سر پر چڑھے سورج کی تپش' راستے میں بڑا مزا دیتی تھی۔ لیکن اسے احساس تھا۔ گرمیوں میں یہی راستہ اس لیے بہت کٹھن ہو جائے گا۔ یونہی سوچوں میں ڈوبتے ابھرتے اس نے گھر کا دروازہ کھول کر صحن میں قدم رکھا تو امی کے ساتھ دھوپ میں چارپائی پر کسی کو بیٹھے دیکھا۔

وہ انتہائی ضعیف' جھریوں بھرا بوڑھا چہرہ' اسے دیکھ کے مسکرایا اور وہ پہچان کے مراحل ایک لمحے میں طے کرتی ہوئی بھاگ کر اس مہربان وجود کی بانہوں میں سما گئی۔

"عظمت بوا! عظمت بوا!" اس کا گلا بولتے ہوئے بھر آگیا۔ اور وہ مہربان وجود' اپنے پُرحدت لبوں سے

محبت کی گرمی اس کے چہرے پہ لکھتا رہا۔

اسے لگ رہا تھا۔ آج شاید اس کے آنسو بہانے کا آخری دن ہے۔ زریاب سے وابستہ کسی بھی شخص کو اس نے کتنی مدت بعد دیکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا۔ چپتی دھوپ کے سفر مسلسل میں ایک مخمل سایہ دار اس کے سر پر آگیا ہو۔ وہ زریاب کی پیدائش سے بھی پہلے سے ان لوگوں کے پڑوس میں رہتی تھی۔ ہر وقت کا آنا جانا تھا۔

زریاب اور رشنا دونوں کی ماؤں کو انہوں نے منہ بولی بہن بنایا اور نبھایا تھا۔ جب تک زریاب اس گھر میں رہا۔ ان کا یہاں آنا جانا بھی تواتر سے لگا رہتا تھا۔ مگر زریاب کی والدہ کے انتقال کے بعد اس میں کافی کمی آگئی تھی۔

یوں بھی یہاں وہ صرف رشنا سے ملنے ہی آتی تھیں۔ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی انتقال کر جانے والی ماں کو یاد کرنے۔ پھر ان کی زبانی' اسے پتا چلا تھا کہ زریاب اپنی بہنوں کو لے کر وہ گھر بیچ باچ کے کہیں چلا گیا۔

کہاں۔۔۔ یہ کسی کو نہیں پتا تھا۔ اس نے جاتے وقت عظمت بوا سے بھی ملنا گوارا نہیں کیا اور رشنا کو تو پہلے ہی اسے دیکھے ہوئے زمانہ گزر گیا تھا۔

آخری بار عظمت بوا تب ہی آئی تھیں۔ اس کے بعد تو سب کچھ جیسے وقت اور حالات کی چکی میں پس کر نگاہوں سے اوجھل ہی ہو گیا۔

وہ جلدی سے محلے کی دکان سے بیسن خرید کر لائی اور بوا کو بہت محبت اور اصرار سے کھانے پر روک کر بیسن کی گرم گرم روٹیاں کھلائیں۔

بوا بہت خوش ہو ہو کر اسے دعائیں دیتی رہیں اور وہ خود بھی ایسے خوش تھی۔ جیسے کوئی خزانہ مل گیا۔ کھانے اور چائے کے بعد امی کو ذرا دیر کے لیے اونگھ آگئی اور وہ بہت ساری باتیں اور یادیں تازہ کرنے کی لالچ میں بوا کو لے کر ڈھلتی دھوپ میں پلنگ کھسکا کر فرصت سے آبیٹھی۔

"بوا! مجھ سے زریاب کی باتیں کریں نا۔" کافی دیر پرانا وقت یاد کرتے گزر گیا۔ جب اچانک ہی اس کے منہ سے نکلا تھا۔

بوا نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔۔۔" وہ ایک گہری سانس بھر کے بولیں۔ "اصل میں تو میں تجھے اس کے بارے میں بتانے کے لیے ہی آئی ہوں۔"

"کیا۔۔۔ کیا بتانے آئی ہیں۔" اس کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے۔

"پہلے سوچا۔ اب تو وقت گزر گیا۔ بتانے کا کیا فائدہ۔۔۔ مگر۔۔۔ دل پر بہت بوجھ ہے۔ شاید کچھ کم ہو سکے۔"

"کیسا بوجھ بوا۔؟" اس کی آواز میں بے تابی تھی۔

"پہلے یہ بتا تیرا کوئی رشتہ وشتہ آیا کہ نہیں۔"

انہوں نے ایک دم موضوع پلٹا۔ وہ جھنجلا گئی۔

"ارے نہیں آیا۔ آپ بتائیں نا' کیا کہہ رہی تھیں۔"

"چل چھوڑ' کیا کرے گی سن کے۔ اب تو وہ چلا گیا' جانے کہاں۔"

"بوا! خدا کے لیے۔ کچھ تو کہیں۔ آپ کو پتا ہے نا وہ کیوں چلا گیا یہاں سے سب چھوڑ کر۔ مجھے چھوڑ کر۔ آپ کو پتا ہے بوا بتائیں نا آپ کو میری قسم۔" وہ باقاعدہ منت پر اتر آئی۔

"وہ تیری بہن کہاں ہے۔" اب انہیں اس کی یاد آگئی۔

"پچ۔۔۔ شادی ہو گئی اس کی۔" اس نے مختصراً" بات نپٹائی۔

"ارے۔۔۔ کس سے ہو گئی؟"

"اوفوہ۔۔۔ ایک بہت امیر' بڑے آدمی کا رشتہ لائی تھی۔ کوئی رشتے کرانے والی۔ چپ چاپ نکاح کر کے روانہ کر دیا۔ بہت کم لوگ شریک ہوئے تھے۔"

"تو ملنے آتی ہے' خوش تو ہے۔؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ خوش ہے۔"

"دیکھ میری دھی! جو بات میں تجھے بتانے جا رہی ہوں نا۔ وعدہ کر اپنے تک رکھے گی۔ کسی کو نہیں

پتانے گی۔"

"ہاں... ہاں... نہیں بتاؤں گی۔" اس نے فٹافٹ شرائط و ضوابط کے مراحل نپٹائے۔

"مجھے رابعہ نے بتایا تھا کہ تو اور وہ آپس میں دودھ شریک بہنیں ہیں۔"

"کیا؟" اس کا منہ کھل گیا۔

"ایسا تیری چچی نے زریاب کو بولا تھا کہ تو اس کی بھی بہن لگتی ہے۔ تیری اور اس کی شادی نہیں ہوسکتی۔" اس کے سر پر سات آسمان ٹوٹ پڑے۔ وہ بے اختیار دل تھام کر رہ گئی۔ مدھم ہوتی دھڑکنیں لگتا تھا۔ ابھی بالکل تھم جائیں گی۔ مگر اصل قیامت تو ابھی باقی تھی۔

"پر اصل بات یہ ہے کہ میری دھی کہ تیری چچی نے جھوٹ بولا تھا زریاب سے۔" اس نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ روکی۔

"ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں گواہ ہوں۔ رابعہ اور تیری' میرے سامنے کی پیدائش ہے۔ بس یہ نمانی اس کی عقل تو گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ مجھے بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر منہ بند کرادیا تھا۔"

"پر... انہوں نے ایسا کیا کیوں؟" اس کی اپنی آواز اسے اجنبی سی لگی۔

"اپنی نمو کو بیاہنا چاہتی تھی زریاب سے' پر ہوا کیا' تجھ سے تو جڑ نہیں سکتا تھا۔ اسے بھی نہیں اپنایا۔ خدا جانے کہاں گیا زمانے کی خاک چھانتے' کہاں ہوگا' کیسا ہوگا۔"

اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ بوا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اصل میں تو میں بھی تیری مجرم ہوں۔ اگر میں اسی وقت رابعہ کو ساری بات سچ بتادیتی تو شاید آج تو ایسے کلی نہ رہ رہی ہوتی۔ پر مجھے کیا پتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد' یہ تیری ماں تیرا بیاہ کہیں اور بھی نہیں ہونے دے گی۔ اسے صرف اپنی دھی کی فکر تھی۔ اس کو بیاہ دیا اس نے۔ تیری کوئی فکر ہی نہیں۔ تو مجھے معاف کردے بچی۔ تاکہ میرا رب سوہنا بھی مجھے معاف کرے۔"

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سسک پڑیں۔

"کتنے دن گزر گئے۔ میں کب سے سوچتی تھی کہ تیرا سامنا کیسے کروں گی۔ میری راتوں کی نیندیں دل کے بوجھ نے حرام کر رکھی ہیں۔ اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا کہ وہ ایسے غائب ہوجائے گا اور تیری ماں نمو کی شادی کرکے تجھے بھول ہی جائے گی۔" اس کی نظریں بوا کے بندھے ہاتھوں پر جم گئی تھیں۔

"وہ مجھے بھول ہی تو نہیں سکیں بوا۔ ان کو میں ہمیشہ یاد رہی۔ چچی جو نہ میری سگی ماں تھیں نہ سوتیلی میری ماں نہ بن سکیں' لیکن نمو کی ماں کا فرض خوب نبھایا انہوں نے۔ اس کے راستے کی ساری رکاوٹیں ہٹاکر اپنی خواہش کے عین مطابق' خوب اونچے پیسے والے گھرانے میں اس کی شادی کی اور میں..."

ڈبڈبائی آنکھوں سے سوچتی وہ کہاں سے کہاں نکل گئی تھی۔

"میں چلی جاتی تو ان کا سہارا کون بنتا۔ مجھے کوئی اور مل جاتا تو میں انہیں چھوڑ دیتی۔ اس لیے میرے آگے بڑھنے کا راستہ بند کردیا انہوں نے۔ میری بیساکھیاں چھین کر مجھے بے سہارا کردیا اور تدبیر بھی ایسی کی کہ اگر حقیقت پتا نہ چلتی تو میں اور وہ ہمیشہ اک دوجے سے شرم سار ہی رہتے۔ وہ مجھے بھول نہیں سکیں بوا! بھول سکتی ہی نہیں تھیں۔ میں انہیں ہمیشہ یاد رہی۔ بس اس پاک ذات کو بھلا دیا انہوں نے جو سب کا' سب سے 'بڑا سہارا ہے۔

آپ نے تو کچھ بھی نہیں کیا بوا۔ مجھے شرمندہ مت کریں۔"

وہ بوا کے ہاتھوں پر چہرہ ٹکا کے رودی۔

☼ ☼ ☼

صبح کا اجالا پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔

ہر چیز موسم کی شدت کی لپیٹ میں تھی۔ کہر زدہ اشجار' اداس رستے' ویران راہیں' اسے ڈرائیونگ کرتے کئی گھنٹے ہوچکے تھے۔

جب وہ اپنے چھوٹے سے شہر کی حدود میں داخل ہوا تو آنکھوں میں سرخی کے ہلکے سے ڈورے تھے۔ اس نے کچھ سوچ کر گاڑی جانے پہچانے راستوں پر ڈال دی۔ کال بیل پر انگلی رکھتے وقت اس کے ذہن میں کسی کا حیرت زدہ ہنستا ہوا چہرہ تھا۔

"زریاب! اف زریاب کے بچے اتنی صبح۔" آئمہ کی چیخ نما آواز پورے فلیٹ میں گونج گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور تازہ پانی کی چھینٹیں چہرے پر چمک رہی تھیں۔ لائبہ ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔ ان کی والدہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوگئی تھیں۔

"میں نے سوچا' سرپرائز دے دوں۔"

"بہت اچھا کیا۔ مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔"

وہ ویسے ہی حلیے میں اس کے سامنے ناشتا کرنے بیٹھ چکی تھی۔

گرم گرم خستہ پراٹھے اور تازہ سنہری آملیٹ کی خوشبو کے ساتھ بھاپ اڑاتی چائے کے مگ نے اس کی آدھی تھکن تو اتار ہی دی تھی۔

لائبہ شرماتی لجاتی اس کے آگے چیزیں رکھتی رہی اور وہ دونوں بہنوں کو دیکھ کر سوچتا رہا کہ بہت جلد دو ٹوک بات کرنا پڑے گی۔

☼ ☼ ☼

نہایت آرام دہ اور عمدہ ڈیزائن سے مزین جہازی سائز بیڈ پر بیٹھی وہ۔ اپنے ریشمی گاؤن کے ربن سہلا رہی تھیں۔ نگاہوں میں کسی سوچ کی گہری پرچھائیں تھیں۔ سامنے کھڑی مؤدب ملازمہ ان کے اگلے حکم کی منتظر تھی۔

کافی دیر بعد وہ ہنکاریں۔ "ٹھیک ہے آج کھانا دینے کی ضرورت نہیں۔ کل شام تک دیکھو۔ پھر بھری ہوئی ٹرالی لے جانا۔ اس کا باپ بھی بھوکے کتوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے گا۔"

ملازمہ شکایت لے کر آئی تھی کہ مسز بابر سلطان جو کہ اب پھر سے نعیمہ گل بن چکی ہے۔ کھانا کھانے کو تیار نہیں ہے۔ وہ احتجاجاً" کھانے سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔

پورا دن گزر چکا تھا۔ کھانا تو دور کی بات' اس نے پانی کا ایک گھونٹ تک نہ پیا تھا۔ مسز رباب اس طرح کے ہتھکنڈوں کو زیر کرنا بخوبی جانتی تھیں۔ انہوں نے اس کا احتجاج اس پر الٹ دیا تھا۔

دو دن تک مسلسل بھوکا رہنے سے' دوسرے دن کی رات تک اس کی آنتیں بری طرح بل کھا گئی تھیں۔ اور تیسرے دن صبح تک وہ اپنی بھوک سے بالکل ہار چکی تھی۔ جب ہی گرما گرم ناشتا دیکھ کر اس سے رہا نہیں گیا۔ مسز رباب تک تمام رپورٹ پہنچ چکی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سنتی رہیں۔

"ٹھیک ہے۔ آرام سے کھالینے دو' پھر ہمیں بتانا۔"

کچھ دیر بعد جب ملازمہ نے اطلاع دی کہ اس نے ناشتا برضا و رغبت ختم کرلیا' تب وہ اٹھیں۔

"ہم اس کے کمرے میں جارہے ہیں۔ کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" وہ بڑے پُر تمکنت اور فیصلہ کن انداز میں بول رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اسکول میں اس کی غیر حاضر دماغی کو سب ہی نے نوٹ کیا تھا۔ دو بار اس نے ایک ہی سوال کا غلط جواب لکھا۔ اس کا دھیان بار بار بھٹک جاتا۔ بچے اس کے سامنے کھڑے سوال کرتے رہتے اور وہ ان کا منہ تکتی رہ جاتی۔

اصل میں تو ہر چہرے کے پیچھے ایک ہی چہرہ چھپا تھا' ہر آواز کی اوٹ سے ایک ہی آواز جھانک رہی تھی۔ بریک ختم ہونے کی بیل بجی تو ساتھی کولیگ کو باقاعدہ اس کا شانہ ہلا کر ہوش میں لانا پڑا۔ باقی کا سارا وقت وہ اپنے آپ کو حواسوں میں رہنے کی تلقین کرتی رہی۔ اس کے ذہن میں وہ دن تھا۔

پھر بھی چھٹی کے بعد گھر پہنچ کر اس نے صحن میں قدم رکھا تو سارا صحن سرما کی نرم حرارت کے بجائے

گھر اس کی چمکتی ہوئی دھوپ سے بھر گیا۔
جب وہ محلے کی ایک خاتون سے چچی کا کوئی کام کہنے گئی تھی اور انہوں نے اسے چائے پینے کے لیے بٹھا لیا تھا اور جب گھنٹے بھر بعد اس کی واپسی ہوئی تو۔
وہیں صحن میں نعیمہ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیں تھیں۔
"کیا ہوا انمو؟"
"کچھ نہیں۔" اس کا انداز صاف ٹالنے والا تھا۔
"زریاب آیا تھا کیا؟"
"تمہیں کیسے پتا۔" وہ اندر کی سمت بڑھ گئی۔
"اس کا مطلب ہے 'آیا تھا۔"
"ہاں آیا تھا۔ امی سے کچھ بات کرنے۔ تمہیں کیسے پتا چل گیا اس کے آنے کا۔" اب کی بار وہ جھنجلائی یوں جیسے کہنا چاہ رہی ہو۔ "تمہیں کیوں پتا چل گیا اس کے آنے کا۔"
"جب پہلے آیا تھا تو آج آنے کا کہہ کر گیا تھا۔ مگر۔۔۔" وہ الجھ سی گئی۔ "اتنی جلدی کیوں چلا گیا۔"
"مجھے کیا پتا۔" اس کا یہ انداز اس بات کا اشارہ ہوتا تھا کہ اب اس موضوع پر بلکہ کسی بھی موضوع پر اس سے کوئی بات نہ کی جائے۔
"چچی زریاب آیا تھا' اتنی جلدی کیوں چلا گیا۔"
اب وہ ان کے سر پر سوار تھی۔
"کہہ رہا تھا' کہیں جانا ہے۔" وہ سلائی مشین کی سوئی میں دھاگا ڈال رہی تھیں۔
"آپ سے کیا بات ہوئی۔" اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر بھی جا سکتا تھا۔
"کوئی خاص نہیں' بچیوں نے سلام کہلوایا ہے اور۔۔۔"
"اور۔۔۔" وہ مشین پر جھکا ان کا چہرہ کھوج رہی تھی۔
انہوں نے سیدھا ہو کر اسے دیکھا۔
"اور کیا کچھ نہیں۔ کیا کوئی خاص بات کرنا تھی اسے مجھ سے۔" وہ الٹا اس پوچھ رہی تھیں۔ اس نے گڑبڑا کر گہری سانس لی۔

"مجھے کیا پتا۔ میں تو خود آپ سے پوچھ رہی ہوں۔" وہ ذرا تیز ہوئی۔
"تو تمہیں اتنی کھدبد جو لگی ہے۔ میں سمجھی کرئی ہوگی کوئی بات۔" وہ کان پر سے مکھی اڑا کر پھر سے مشین پر جھک چکی تھیں۔
وہ الجھن بھرے انداز میں دھیرے سے اٹھی۔
"اتنی جلدی کیوں چلا گیا اور وہ بھی مجھ سے ملے بغیر۔"
امی نے کن انکھیوں سے اسے جاتے دیکھا۔ پھر پکار بیٹھیں۔ "سن!"
وہ یوں ہی بے خیالی میں چلتی ان تک آئی تھی۔
"ذرا یہ سوئی میں دھاگا تو ڈال دے۔" انہوں نے بہت دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

زریاب جانتا تھا' آئمہ اسے پسند کرتی ہے' مگر اپنے لیے نہیں' اپنی چھوٹی بہن لائبہ کے لیے۔
آئمہ اس کی بہت اچھی دوست تھی اور محض ایک کولیگ سے دوست اور پھر بہت اچھی یا سب سے اچھی دوست بننے کے لیے زیادہ تر کوشش خود آئمہ نے ہی کی تھی۔ وہ آفس میں شروع سے کافی لیے دیے انداز میں رہتا تھا۔ آئمہ نے خود ہی آگے بڑھ کر کئی دفعہ زیادہ کام کا بوجھ اس کے سر سے اپنے کندھوں پر لیا۔ خوش اخلاق تو وہ تھا' لیکن اتنا فری کسی سے نہیں ہوتا تھا کہ غلطی سے بھی کسی کو اس کے ماضی میں جھانکنے یا ذاتیات میں دخل اندازی کا موقع مل سکے۔
ایسے میں آئمہ کی بے تکلفی کو اس کی دلچسپی سمجھ کر وہ اس سے کھنچا کھنچا ہی رہتا تھا۔ لیکن ایک دن آئمہ نے خود ہی اسے بتا دیا کہ اس کی خاندان میں کہیں بات طے ہو چکی ہے اور اس کا فیانسی چند سال کے لیے ملک سے باہر گیا ہے۔ اس کی واپسی پر شادی ہو گی یا پھر وہ بھی باہر چلی جائے گی۔
غلط فہمی کے بادل چھٹنے کے ساتھ ہی ان کی آپس کی بے تکلفی بڑھنے لگی اور ایک اچھی دوستی میں بدل گئی۔ وہ خود بھی کئی سال اکیلے پن کا عذاب جھیلتے

جھیلتے تھک چکا تھا۔ مسز رباب کی حیثیت اس کے لیے بالکل ایک مالک یا محسن کی سی تھی۔ ان سے دوستی یا اتنی بے تکلفی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ عمروں کا فرق بھی ایک واضح پہلو تھا۔
ایسے میں آئمہ کی بے غرض دوستی کو اس نے نعمت خداوندی کی طرح قبول کیا۔ مگر اپنے ماضی کے بارے میں بتانے کی غلطی بہرحال نہیں کی۔
آئمہ اس کی بہنوں سے مل چکی تھی۔ جس دن زریاب کی پروموشن ہوئی اور وہ آئمہ کے سینیئرز میں شامل ہوا۔ اس دن آئمہ کو اسے اپنا بہنوئی بنانے کا انوکھا خیال سوجھا۔ اس نے نہ صرف فوراً" ہی اپنے گھر میں بھی ذکر کر دیا' بلکہ زریاب کو بھی اپنا ہم خیال بنانے میں دیر نہیں کی۔ اسے اپنی اور زریاب کی دوستی پر بہت بھروسا تھا۔
اسے یقین تھا' زریاب' اس کی بات سے کبھی انکار نہیں کرے گا۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ زریاب نے نہ صرف پہلی بار سنتے ہی معذرت کر لی تھی۔ بلکہ اسے آئندہ بھی اس قسم کی کوئی بات کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا لہجہ اتنا سخت اور بے لچک تھا کہ آئمہ اس سے وجہ تک نہ پوچھ سکی۔ مگر۔۔۔ بہرالحال اسے اپنی حدود کا اندازہ ضرور ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم اچھی طرح سوچ لو۔" کمرے کے سناٹے میں ان کی نرم اور پُرخلوص آواز گونج رہی تھی۔
اتنے دن سے اس کا چیخنا' چلانا' مزاحمت احتجاج اور بھوک ہڑتال۔ سب ہی کچھ بے کار گیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ بظاہر سب جیسے نظر آرہے تھے۔ ویسے تھے نہیں۔ نہ اتنے رحم دل' نہ پُرخلوص' نہ سچے' نہ سیدھے اور نہ ہی شریف۔
"حالانکہ میں اتنا ٹائم ضائع کرنے کے حق میں نہیں۔ لیکن صرف تم کو سنبھلنے کے لیے وقت دینا چاہتی ہوں۔ کیونکہ راستہ بہرحال ایک ہی ہے اور تمہارے سامنے ہے۔" خاموشی کے وقفے میں اس کی

دم توڑتی سسکیاں ابھر آتی تھیں۔
"فیصلہ تمہیں وہی کرنا ہے' جو ہم نے کروانا ہے' جلد یا بدیر اور ہو سکتا ہے' زیادہ دیر لگانے پر ہمیں تم پر اپنا فیصلہ ٹھونسنا پڑے۔ میں ایسا نہیں چاہتی۔ مجھے زور زبردستی اور تشدد پسند نہیں ہے۔ بہتر ہو گا تم خود ہی اپنے لیے بہتر فیصلہ کر لو۔ بھول جاؤ تمہارا کوئی ماضی تھا۔ تمہارا کوئی گھر تھا۔ شوہر تھا۔ یوں سمجھو وہ بدحال اور بدکردار آدمی اور وہ غربت بھری زندگی جو تم نے شادی سے پہلے گزاری' سب ایک بھیانک خواب تھا۔" وہ بہت دل فریبی سے لفاظی کا سنہرا جال اس کے گرد بن رہی تھیں۔
"اور خوابوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ آنکھ کھلی اور خواب ختم۔ بعض اوقات تو یاد بھی نہیں رہتا کہ۔۔۔"
ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ چکی تھی۔
"خدا رسول کا واسطہ ہے۔ اگر تمہاری کوئی اولاد ہے۔ کوئی بیٹی ہے یا تم خود کسی کی بیٹی ہو تو واسطہ ہے تمہیں اس رشتے کا۔ مجھے جانے دو۔ میں۔۔۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ مجھے جانے دو' میں وہ سب نہیں کر سکتی جو تم چاہتی ہو' خدا کے لیے۔" وہ ان کے پیر پکڑے بلک رہی تھی۔
مسز رباب کے لیے یہ التجائیں' یہ منتیں کوئی نئی نہیں تھیں۔ کتنی ہی لڑکیاں ان کے پیروں میں گر کر ان کے قدموں میں سر رکھ کر گڑگڑائی تھیں۔ وہ نہ تو پہلی لڑکی تھی' نہ آخری۔ انہوں نے دھیرے سے اپنے پیر پیچھے کیے۔
"بے کار میں وقت ضائع کر رہی ہو۔ اتنا کیوں رو رہی ہو میری جان۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی اونچی کر کے اس کا سرخ چہرہ دیکھا۔ "دیکھو کیا حال کر لیا ہے اور اگر میں تمہیں جانے بھی دوں تو تم جاؤں گی کہاں ہم م م۔۔۔"
وہ بدستور سسک رہی تھی۔
"اٹھو۔۔۔ اٹھو۔" بے مثال ہمدردانہ اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے انہوں نے اسے بستر پر بٹھا دیا۔ "تم

اپنے گھر نہیں جاسکتیں چندا۔ کیونکہ اب تک تو تمہارا وہ نام نہاد خاوند تمہیں کسی فارن کنٹری میں مار چکا ہوگا۔ کوئی بھی ریزن دے کر۔ بلکہ اب تک تو تمہاری تدفین بھی ہوگئی ہوگی۔ کسی ایسے قبرستان میں جہاں تمہاری وہ دمے کی مریضہ بوڑھی ماں کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ ایک ایسی قبر میں جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں اور جس کا کتبہ تمہارا کوئی نام لیوا کبھی نہیں پڑھ سکتا۔" اس کا چہرہ دیکھ کر انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

وہ حیرت کی انتہا سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس سے وہ نعیمہ کو بالکل اس خون آشام ڈائن کی طرح لگیں۔ جو اپنے نوکیلے پنجوں سے اس کا وجود کھسوٹنے اور لمبے دانتوں سے خون پینے کے لیے بالکل تیار بیٹھی ہو۔

"ان کے لیے تم مرچکی ہو ڈارلنگ! وہ تمہاری ان دیکھی موت پر رو دھو کر صبر کرچکے ہوں گے۔ بلکہ اب تک تو وہ تمہارے قل کے چنے بھی بانٹ چکے ہوں گے۔" وہ ایک بار پھر سے قہقہہ لگا رہی تھیں۔ نعیمہ نے بے حد نفرت سے ان کا مکروہ چہرہ دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ ان کا خوب صورت چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچ کر اتنا بھیانک کردے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ لیکن وہ جانتی تھی' وہ ایسا نہیں کرسکتی۔ کم سے کم انہیں دھکا دے کر یہاں سے نکل ہی بھاگے' مگر ایسا بھی ممکن نہ تھا۔

اسے اپنے کمرے سے لے کر بیرونی دروازے تک کا راستہ بھی ٹھیک سے معلوم نہ تھا اور فاصلہ کتنا تھا' یہ بھی معلوم نہ تھا۔ پتا ہوتا تو بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ اس محل کی ملکہ کے پالے ہوئے دیوہیکل باڈی گارڈز اور ڈھیروں ملازم "ایک پل" میں اسے چت کرسکتے تھے۔

"ایک پل" میں وہ ممکنات کا سفر دور تک طے کر آئی تھی۔

بلکہ۔۔۔ بلکہ وہ تو۔۔۔

اس نے عورت کے اشاروں پر چلتے ہوئے اس کے ساتھ کچھ بھی۔۔۔

آگے سوچنے کی اس کی ہمت نہیں تھی۔ اسے پورے جسم کے رونگٹے کھڑے محسوس ہوئے۔

☼ ☼ ☼

فضا میں سوگواری کی باس کے ساتھ اگربتیوں کی خوشبو گھل مل رہی تھی۔ گھر کے اکلوتے کمرے میں بچھی چاندنی پر دس' بارہ عورتیں بیٹھی سیپارے پڑھ رہی تھیں۔ ایک کونے میں سلمیٰ بیگم' رشنا کی بانہوں میں سمٹی سسک رہی تھیں۔ پر ذرا دیر کے بعد وہ بے قابو ہوکر پچھاڑیں کھانے لگتیں۔

"نمو۔۔۔ میری نمو۔۔۔ ہائے کہاں چلی گئی تو نمو۔"

ایسے میں رندھے گلے سے انہیں صبر کی تلقین کرتی رشنا کو خود بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ نمو اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

"امی! امی! طبیعت خراب ہوجائے گی' پلیز سنبھالیں خود کو۔" دائیں طرف بیٹھی عظمت بوا دلاسا دینے میں ناکام تھیں۔ خبر تھی ہی اتنی غیر متوقع اور اندوہناک۔ عورتیں ترحم بھرے انداز میں بین کرتی سلمیٰ بیگم کو دیکھتیں اور پلکیں صاف کرکے پھر سے سیپارہ پڑھنے لگتیں۔

"اپنے آپ کو سنبھالیں۔ اللہ سے اس کے ایصال ثواب کی دعا کریں نا۔ اللہ اسے سکون دے۔" وہ خود بری طرح بکھر چکی تھی۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا' وہ اندر سے کتنی کمزور ہوچکی ہے۔

کل جب پڑوس میں بابر سلطان کے فون کی خبر آئی تو اس کے بھی وہم و گمان میں نہ تھا' وہ اسے کیا خبر سنانے والا ہے۔ اپنے اندازوں کی آخری حد پر جاکے بھی وہ نمو کی موت کے بارے میں تو کبھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

"لیکن اتنی اچانک کیسے؟" صدمے کے مارے اس کے منہ سے ڈھنگ سے بات بھی نہ نکل سکی تھی۔

"بس خدا جب بلائے تو بندے تو کچھ نہیں کرسکتے نا۔" پتا نہیں وہ کون تھا۔ بابر سلطان سے اس کا کیا رشتہ تھا۔

"بہت برا ایکسیڈنٹ تھا جی۔ بھابھی جی تو پہچانی نہیں جارہی تھیں۔ بابر بھائی کی حالت بھی نازک ہے۔ یہیں دبئی کے اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ آپ دعا کیجیے گا جی۔ اللہ انہیں بہتر کرے اور بھابھی جی کی مغفرت کرے۔ ڈیڈ باڈی کی حالت بہت خراب تھی۔ پاکستان بھجوانے کا ٹائم نہیں تھا۔ اس لیے یہیں تدفین کروا رہے ہیں۔" فون کرنے والا خود بھی سوگوار تھا۔

اس کی اپنی حالت تو دیدنی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد وہ وہیں اتنا بکھر کے روئی تھی کہ سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا۔ سلمیٰ بیگم تو پھر ماں تھیں۔ ان سے صبر کی امید رکھنا بے وقوفی ہی تھی۔

"بے چاری کی ایک ہی تو اولاد تھی' وہ بھی گئی۔"

"بے سوچے سمجھے' پیسے کی لالچ میں' انجان لوگوں میں لڑکی دے دی۔ آخری شکل تک دکھانے نہ لائے' اب کیا کرے گی۔"

"ارے نجانے کہاں جاکے اس کا آخری ٹیم لکھا تھا۔ دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔"

"چچ چچ۔۔۔ کوئی لڑکا ہی ہوتا بڑھاپے کا سہارا۔"

ایصال ثواب اور تعزیت کے لیے آئی تمام عورتوں کو ان سے ہمدردی تھی' مگر اپنے اپنے انداز میں۔

☼ ☼ ☼

"آفس سے واپسی پر مجھے مارکیٹ لے چلو گے۔" آئمہ اس کے آفس میں بیٹھی تھی۔

"کیوں۔۔۔ میرا ساتھ جانا ضروری ہے کیا؟"

"نہیں بس' بے عزتی کروانے کا موڈ ہو رہا تھا' اس لیے آگئی۔" کمپیوٹر اسکرین پر نگاہیں جمائے وہ مسکرا رہا تھا۔

"اوفوہ۔۔۔ اس موڈ کو ذرا سمجھاؤ۔ ایسی بے تکی فرمائشیں' اف اب تمہاری انسلٹ کرتا کیا میں اچھا لگوں گا۔"

"اب تو کردی نا' اب کیا۔۔۔" وہ روٹھی روٹھی سی تھی۔

"اوفوہ آج کچھ زیادہ ہی نخرہ دکھایا جارہا ہے۔"

"تمہارے اوپر اٹھانے کی پابندی نہیں ہے۔"

"ہاں پابندی تو نہیں' مگر پھر بھی اب کیا میں اپنی اکلوتی دوست کے نخرے بھی نہیں اٹھا سکتا کیا۔" وہ چپ رہی۔

"تو بھی چلیں۔" اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"اللہ زریاب ابھی۔۔۔ چلو چلو' مجھے کیا اعتراض ہوگا۔"

"تمہارا کام ہوگیا۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں بالکل فنیش۔۔۔ میں ابھی بیگ لے کر آتی ہوں۔" وہ خوش ہوگئی۔ لیکن زریاب کی ساری

خوشی پر پانی پھر گیا جب اسے پتا چلا کہ وہ لائبہ کی برتھ ڈے کے لیے گفٹ لینے آئی ہے۔

اس کی دلچسپی ختم ہوچکی تھی۔ وہ بے دلی سے ہوں ہاں کرتا رہا۔ بلکہ بے مروتی کی انتہا کرتے ہوئے اس نے خود سے کوئی بھی گفٹ لینے سے انکار کردیا اور یہ بھی جتا دیا کہ ہوسکتا ہے وہ اس پارٹی میں شریک نہ ہوسکے۔

آئمہ اس کا گریز جانتی تھی۔ وہ خود آئمہ کی خواہش سے لاعلم نہ تھا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ دوبارہ کبھی آئمہ سے کہہ نہیں سکا کہ وہ لائبہ کا ذکر اگر اس کے سامنے اس لیے کرتی ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اس کی طرف متوجہ ہوجائے گا تو یہ کوشش فضول ہے۔ نہ ہی آئمہ نے اپنی کوشش ترک کی۔ وہ پرامید تھی کہ کبھی نہ کبھی زریاب کو لائبہ کا نصیب بنا ہی دے گی۔

وہ بہت اچھا انسان تھا۔ آئمہ کا دوست تھا اور آئمہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایک تو اسے اردو نہیں آتی۔" مسز رباب اس سے پریشان تھیں۔

"سکینہ! تم اسے سکھانے کی کوشش کرو' اگر اسے اردو تھوڑی سی آجائے تو اچھا ہے۔" وہ سامنے بیٹھی شاہل کو بے زار نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"یہ زریاب بھی کیا چیز اٹھا کے لایا ہے۔" بات نہ سمجھ پانے کے باعث وہ یہاں کے دوسرے ملازمین کے لیے مسئلہ بن رہی تھی۔

"اچھا۔ وہ ہے نا مٹھل۔" وہ کچھ سوچ کر سکینہ سے مخاطب ہوئیں۔ "اسے اس کے پاس لے جاؤ' کہنا کہ اسے سندھی آتی ہے۔ اردو سکھا دو۔ تھوڑی بہت تو یہ بھی بول ہی لیتی ہے۔ رواں ہوجائے تو اچھا ہے۔" انہوں نے اپنے ڈرائیور کا ذکر کیا۔

ملازمہ سر ہلاتی اسے لے کر چلی گئی۔

"اب میرے کرنے کو کوئی کام نہیں بچا' جو میں یہ کھڑاگ سمیٹوں بیٹھ کر۔" بے زاری سے بڑبڑاتی ہوئی وہ سیل پر کوئی نمبر ملانے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"بوا! آج مت جائیں نا۔ یہیں رک جائیں میرے پاس۔" وہ بہت منت سے بول رہی تھی۔ آج تیسرا دن تھا اسے' بوا سے یہی فرمائش کرتے ہوئے پتا نہیں وہ اتنی خوف زدہ کیوں تھی۔

"کب تک رکی رہوں گی یہاں' وہاں گھر پر بھی میرا انتظار ہورہا ہوگا۔"

"نہیں میری مجبوری بتائیں' مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ارے ڈر کیسا۔ تو اکیلی کہاں ہے۔ وہ تیری ماں ہے نا۔" بوا کی تسلی کتنی بودی تھی۔ وہ خود بھی جانتی تھیں۔ جب ہی ان کا لہجہ کمزور تھا۔ اس نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر زندہ لاش کی مانند پڑی اپنی ماں کو دیکھا۔

"اچھا صرف آج۔"

"آج نہیں تو کل۔ مجھے جانا تو ہوگا نا۔ اصغر گھر سے نکل گیا ہے۔ پہنچنے ہی والا ہوگا۔" بوا نظریں چرائی بول رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ پھر اس سے کچھ کہا نہیں گیا۔

☼ ☼ ☼

زندگی کرنے کے باقی سب ہی راستے مسدود ہوچکے تھے۔

صرف ایک راستہ کھلا تھا۔ گناہ کا' غلیظ گندگی میں لتھڑا راستہ اور اسے اس گندگی میں اترنا ہی تھا۔ گردن تک یا پھر شاید سر تک۔ بہت مشکل تھا۔ اس کے لیے اپنے آپ کو اس راستے پر آمادہ کرنا' لیکن مسز رباب کو اس مشکل کو آسان بنانا آتا تھا۔ بہت اچھی طرح۔ دیر سے ہی سہی' لیکن اپنے خوب صورت چہرے پر سے دوستانہ نقاب اتار کر وہ ایک بار پھر اس کے روبرو تھیں۔

"دیکھو' میں آخری بار پوچھنے آئی ہوں تم سے۔"

"میرا جواب پتا ہے' آپ کو میں۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ خائف تھی۔ اس کی بات میں انکار تھا۔ مگر لہجے میں دم نہیں۔

"میں نے سوچا' شاید تم نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہو۔"

وہ چپ رہی۔

"کیوں خود سے دشمنی پر اتر آئی ہو تم؟" انہوں نے اپنے تئیں اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی۔ پھر دروازے سے کسی کو آواز دی۔

"مٹھل۔ او مٹھل۔"

چند لمحوں بعد دروازے سے دیو ہیکل' ڈراؤنا چہرہ نمودار ہوا۔ جس کی نوک دار مونچھیں بڑھ کے اس کے کانوں کی لوئیں چھو رہی تھیں۔ موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے اور نظریں ندیدوں کی طرح اس کے وجود پر چپک رہی تھیں۔

"لو بھئی مٹھل! سنبھالو' اب خود ہی۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھتی سرہانے سے چپٹ سی گئی تھی۔ مسز رباب ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھتی اٹھ کر دروازہ بند کرتی باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

دن ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے کتنے آگے نکل گئے تھے۔

شاہل اردو بولنا سیکھ رہی تھی۔ اسے کپڑے پہننے کی تمیز بھی آگئی تھی اور وہ محنتی بھی بہت تھی۔

مٹھل سے نعیمہ کی دھجیاں اڑوانے کے بعد' اسے اپنے راستے پر لگانا بہت سہل ثابت ہوا۔ اس کے اندر یقیناً" کسی مٹھل کو دوبارہ برداشت کرنے کی ہمت نہیں بچی تھی۔

ایک ہفتے تک اس کے چہرے پر دردناک سوجن چڑھی رہی۔ جسم کا ایک ایک انگ دکھتا رہا۔ نوکیلے ناخنوں کی کھرونچوں سے خون رستا رہا۔ جبڑے اپنی جگہوں سے جیسے ہل گئے تھے۔ ٹانگیں اینٹھ چکی تھیں اور سر کے پچھلے حصے میں کئی جگہوں پر درد کا احساس ابھی تک باقی تھا۔

دو دن تک تو وہ بستر پر کروٹیں بدلنے کے لیے بھی دوسروں کی محتاج رہی تھی اور ایک ہفتے بعد جب اس کے جسم اور چہرے کی نیلاہٹیں ہلکی زردی میں بدل چکی تھیں' تو وہ ایک بار پھر اس کے کمرے میں موجود تھیں۔

اس بار صرف وہ بولتی رہیں۔ اس نے جواب میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بس نفرت آمیز نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"لیلیٰ آئے گی رات میں۔ اچھی طرح ڈریس اپ ہوجانا۔ میں سوٹ اور جیولری بھجوا دوں گی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر دروازے کی طرف بڑھیں۔ پھر کچھ سوچ کر اس تک پلٹ آئیں۔

"بے فکر رہو میری جان۔ آج رات تمہارا سامنا مٹھل جیسے کسی وحشی سے نہیں ہوگا۔" وہ مسکرا کر اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں۔

"اور اگر آئندہ بھی میرے کہنے پر چلتی رہیں' تو میں تمہارا خاص خیال رکھوں گی۔" اس نے نفرت سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

ڈوبتے سورج کی شعاعوں کا عکس ٹھہرے پانیوں میں بھی نارنجی رنگ گھول رہا تھا وہ کراچی آتا تو اکثر ہی یہاں آتا تھا۔ لیکن اسے کراچی آنا نہیں تھا۔ اسے کوئی کام نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ یہاں آگیا تھا۔

وہ خود بھی بے خبر تھا۔ اپنے مستقبل سے لاعلم۔ حال سے انجان صرف ماضی کے سیاہ اوراق پلٹتا۔ ان رنگوں میں' ان یادوں میں ڈوبتا ابھرتا رہتا۔

ان گلیوں میں بھٹکتا رہتا۔

جہاں اس کا شرارتی بچپن' امنگوں بھرا لڑکپن اور خوابوں سے سجی جوانی گزری تھی۔ شوریدہ سر لہریں' اس کے شکستہ قدموں سے ٹکرا کر پلٹتی رہیں۔ جھکے کندھوں کے ساتھ رک رک کے قدم سے ساحلوں کی تنہائی بانٹتا رہا۔ کبھی کبھی کوئی آواز اس کے قدم تھام لیتی۔

"وہ تمہاری بہن ہے' رضاعی بہن' تم نے اس کے بارے میں سوچا بھی کیسے۔"

سماعتوں میں ٹوٹے کانچ چبھتے رہے۔ پگھلا سیسہ انڈیلتے سفاک الفاظ بپھری ہوئی موجوں کا شور شرابا چیر کر اس تک پہنچتے رہے۔

جلتی آنکھوں کے سرخ ڈورے گہرے ہوتے رہے۔ ناکام تھکے ماندے قدم جوتے کی نوک سے پتھر اڑاتے رہے۔

☼ ☼ ☼

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

صبح اسکول' دوپہر میں گھر کے کام اور شام میں ٹیوشنز کی لگی بندھی روٹین پر وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتی تھی۔ ایک سپاٹ تاثر ہمہ وقت چہرے پر جما بیٹھا رہتا تھا۔ بے رنگ آنکھیں اب کسی بات پر جگمگاتی نہیں تھیں۔ اسے پہلی تنخواہ کا بہت انتظار تھا۔ اس کی بہت سی خواہشیں اس پہلی تنخواہ سے جڑی تھیں۔ مگر ہوا کیا۔

اس نے وہ تنخواہ وہاں خرچ کی جہاں کا گمان بھی نہ تھا۔

دو کلو چاولوں کی قبولی پکا کر نعیمہ کے ایصال ثواب کے لیے مسجد اور محلے میں بھجوائی۔ قرآن خوانی کا اہتمام کیا اور اس کے لیے منگائی گئی چاندنیوں اور پانی کی ٹنکی کا کرایہ دیا۔ قرآن خوانی کے بعد چائے میں ڈالا جانے والا دودھ اور پتی بسکٹ اور سموسے۔

گوکہ کسی کے انتقال پر ملال پر آنے والی خواتین کا کھانا پینا کوئی ایسا ضروری امر نہ تھا۔ لیکن جہاں اہتمام کے ساتھ دیگیں پکوائی جاتی ہوں اور دونوں ٹائم بریانی خوشبوئیں لٹاتی ہو وہاں اس غربت میں اتنا اہتمام بھی اس کے لیے بہت داد و ستائش کا باعث بنا۔ گوکہ اس کی یہ نیت نہ تھی۔ مگر وہاں کی ریت تو تھی۔

اور تیسرے دن کے بعد سے وہ جیسے پتھر کی ہو گئی۔

زریاب کے بچھڑ جانے کے بعد اس میں کسی اور کی جدائی سہنے کی طاقت نہیں بچی تھی اور وہ بھی دائمی جدائی۔ نمو جیسی بھی تھی اور اس کے ساتھ جو بھی کر کے گئی تھی' تھی تو اس کی بہن ہی نا۔ وہ زندگی میں بے شمار بار اس کے ساتھ مل کر ہنسی تھی' روئی تھی۔ نمو اس کی محبت سے واقف نہ تھی۔ لیکن اس کو تو نمو کے دل کا حال پتا تھا اور پھر جب نمو کی شادی ہوئی تو اس نے اس کی دائمی خوشیوں کے لیے صدق دل سے کتنی دعائیں کی تھیں۔

شروع میں دو' تین بار جب وہ اس سے ملنے آئی تو ماحول میں ایک واضح فرق کے باوجود کتنی خوش تھی۔

"برائیاں کس میں نہیں ہوتیں روشی' پر میرے میاں دوسرے آدمیوں سے بہت اچھے ہیں۔ اب یہی دیکھ لو کہ ایک بار کہا کہ گجرے اچھے لگتے ہیں۔ اب ہر بار کہیں باہر نکلوں تو کلائیاں کبھی خالی نہیں ہوتیں۔"

اس کی شوخ زندہ دل آواز ابھی کانوں میں آباد تھی۔ کیا میں وہ آواز دوبارہ کبھی سن نہیں سکوں گی۔

اپنے آپ کو یقین دلاتے دن کے تمام ہی پہر کہیں ادھر ادھر ہو جاتے۔ اداسی میں گھرا سرا اس کے لیے دکھوں بھری شامیں ہی لایا تھا۔ سورج کی تپش میں ہونے والا معمولی سا اضافہ جہنم کے دروازے جیسا لگتا تھا۔

کبھی آنسو کہیں سے بھولے بھٹکے اس کی آنکھوں کی خشک دہلیز سے نکل آتے تو وہاں کی ویرانیوں میں ان کا بھی جی نہ لگتا اور وہ گرنے سے پہلے ہی انہیں رگڑ ڈالتی۔

☼ ☼ ☼

راتیں جاگ اٹھی تھیں۔

تلخ جام گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد' بے دریغ لنڈھانے کی عادت پڑ گئی۔ میک اپ کی تہوں میں اس کے چہرے پر پڑی اذیت کی دراڑیں چھپ گئیں۔ بڑی سی چادر کی اوٹ سے ڈھکا رہنے والا جسم اب ایک کھلی دعوت عام کا روپ دھار چکا تھا۔ لمبی لمبی گاڑیاں' جن کے دروازوں میں لگے آٹومیٹک لاک بھی نہ تو کھولنا اس کے بس کی بات تھی نہ بند کرنا۔ اب وہ ان کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کی پریکٹس کر رہی تھی۔

رنگ برنگے لینسز کے پیچھے اس کی التجا کرتی آنکھوں کا رنگ کیا تھا۔ شاید اسے خود بھی یاد نہیں رہا تھا۔

سوکھی اور سانولی کلائیاں' صحت مند ہو کر جتنی پرکشش ہوتی گئیں۔ انہیں تھامنے اور مروڑنے والوں کی تعداد میں اتنا ہی اضافہ ہوتا گیا۔

کبھی ایک بڑا سا دوپٹا اوڑھے وہ گھر کے اندر اور باہر کے کتنے کام نمٹا لیتی تھی۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا اور اب اسے ایک بالشت کا اسکارف سنبھالنا بھی مصیبت تھا۔

"اوفوہ۔" وہ اکثر الجھ کر اس کو محفلوں میں صوفے کی پشت پر ڈال کے اٹھانا بھول جاتی۔

نیا نام' نیا چہرہ' نئی شناخت اور نیا شناختی کارڈ' بلکہ پہلا شناختی کارڈ اور اب پاسپورٹ بھی۔

"پاکستان میں تمہارے صحیح قدردان نہیں ہیں ڈارلنگ۔ تمہیں تو وہاں ہونا چاہیے۔ جہاں پر ہر شخص کوئی تمہاری شان میں قصیدے پڑھے۔ تمہارے حسن کی دن رات نظر اتارے۔"

"لیکن میں اکیلی نہیں جاؤں گی' آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" اندر کہیں ان ہی تنگ و تاریک گلیوں میں بسنے والی لڑکی آج بھی چھپی بیٹھی تھی۔

"میں کیا کروں گی جا کے' کام تمہارا ہے' جانا بھی تم ہی کو ہو گا جانی۔" مسز رباب کی اداوں کا وہی عالم تھا۔

☼ ☼ ☼

اماوس کی راتیں اور جاڑے کی اداسی مل کر راتوں کو کچھ اور بھی تنہا کر دیتے۔ اسے بھی اداسی پورے کمرے میں چکراتی ہوئی لگ رہی تھی۔ آج رسولن بڑی بی بی کے ساتھ ہی کہیں گئی تھی۔ شاید کام والی کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے ۔ اس کے کوارٹر میں کبھی رات کو اکیلے رکنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

ان کی خادمہ خاص جو اندرونی اور بیرونی معاملات اور دوسرے نوکروں کی نگرانی پر مامور تھی۔ وہ اور اس جیسے دوسرے ملازمین جو نچلے درجے سے ذرا اوپر کہلاتے تھے۔ ان کے کمرے گھر کی سب سے اوپری منزل پر تھے۔ وہ یہاں سرونٹ کوارٹرز میں نہیں رہتے تھے۔

شاہل یہاں آکے خوش بھی تھی اور مطمئن بھی۔

تیز سرد ہوا سے دروازے کے پٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ اس کو ان آوازوں سے ڈر سا محسوس ہوا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ گھبرا کے باہر نکل آئی۔ لان کی سائیڈ پر چند ایک لائٹیں جل رہی تھیں اس نے دور کونے میں چوکیدار کی کرسی پر مٹھل کو بیٹھے دیکھا شاید آج اس کی گاڑی کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس کی انگلیوں کے بیچ دبی سگریٹ کا شعلہ دہک رہا تھا۔

مٹھل بھی اسے دیکھ چکا تھا وہ اٹھ کر تیز قدموں سے اس کی طرف آیا۔

"کیا بات ہے۔" اسے سندھی آتی تھی مگر یہ بڑی بیگم کا حکم تھا کہ اس کو اردو سکھاؤ۔

"میں کو ڈر لگ رہا ہے اور اکیلے۔"

"ارے تو اکیلی ہے۔ رسولن کہاں ہے؟"

"وہ گئی بی بی کے ساتھ۔" وہ ابھی بولتے ہوئے اٹک جاتی تھی۔ اسے بتاتے وقت اندازہ نہیں تھا کہ بی بی کے ساتھ رسولن نہیں باقی لڑکیاں بھی جا چکی ہیں۔ گھر پر چند ایک ملازمین کے سوا کوئی نہیں۔ جو ہیں بھی تو اوپری منزل پر' سردی کی شدت سے کمروں میں دبکے آرام سے سو چکے ہیں۔ لیکن مٹھل۔۔۔

وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ رات شاہل کی خوشی اور اطمینان کی آخری رات ہے۔

☼ ☼ ☼

آفس کی سرگرمیاں معمول کے مطابق جاری و ساری تھیں۔

"مجھے کل کراچی جانا ہے۔" آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد اس نے آئمہ کو اطلاع دی تھی۔ "ایک پارٹی میں شرکت کرنی ہے۔ تم بھی چلو۔"

"میں انویٹیشن کے بغیر کہیں نہیں جاتی۔ تم

انجوائے کرو۔"

آئمہ، بیگم رباب بختیار کو صرف اس کی آنٹی کی حیثیت سے جانتی تھی۔ یہ بھی ان ہی کی ہدایت تھی کہ وہ اپنے اور ان کے تعلقات کا زیادہ چرچا نہ کرے۔ خاص طور پر اس نئی جگہ جو کہ ایک این جی او تھی۔

"زریاب! سنو۔" وہ مڑتے مڑتے رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"پلیز اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ تم بہت کمزور ہوتے جارہے ہو۔"

اس قدر غیر متوقع بات پر اس نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر دھیرے سے تھینک یو کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ آئمہ دیر تک وہیں کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

اس طرح کے فنکشنز میں مسز رباب اسے انوائٹ نہیں کرتی تھیں، مگر اس بار ان کا موڈ ہی کچھ اور تھا۔

ایک بہت بڑی بزنس ڈیل جو پچھلے کئی مہینوں سے مختلف مسائل اور رکاوٹوں کا شکار تھی۔ اسی مہینے فائنل ہوئی تھی۔ آرڈر اتنا بڑا تھا کہ ان کے بزنس کو اس آرڈر کی تکمیل کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا بریک ملنے والا تھا۔

وہ بے انتہا خوش تھیں۔ اسی لیے پارٹی میں، زریاب کو آتے دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف بڑھ کے اس کے گال سے گال ملا کر اپنی گرم جوشی کا اظہار کر گئیں۔ ورنہ اس کے سامنے وہ بہت سنبھل کے بہت احتیاط سے رہتی تھیں۔

"کیا بات ہے آنٹی! آج تو آپ بہت زبردست لگ رہی ہیں۔" اس نے بھی ذرا بے تکلف انداز میں تعریف کر ڈالی۔ بلیک جارجٹ کی ساڑھی میں ان کا تقریباً "ٹاپ لیس بلاؤز" نہیں، بہت ہی بولڈ بنا رہا تھا۔

"اوہ یو نائی بوائے۔" انہوں نے ایک ناز سے مسکرا کے اس کے کاندھوں پر مکا جڑ دیا۔ "تم نے مجھے کبھی فل فارم میں دیکھا ہی کہاں ہے۔" اب وہ ذرا فخریہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔ "آؤ میں تمہیں اپنے سرکل کے دوسرے لوگوں سے ملواؤں۔"

وہ بہت اسٹائل سے اس کے بازو میں ہاتھ ڈال کے آگے بڑھ گئیں۔

ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔

طرح طرح کے لوگ، بزنس مین، بیوروکریٹس اور سرکاری عہدے داران شامل تھے۔ ابھی وہ ان سے مل کر ٹھیک طرح سے مرعوب ہو بھی نہیں پایا تھا کہ روشنیوں سے چمکتے ہال کے ایک کونے میں اس کی نگاہ پڑی اور پھر وہیں جم کے رہ گئی۔

وہ اگر وہ نہیں تھی جسے وہ ماضی میں کبھی جانتا تھا۔ تب بھی اس سے غضب کی مشابہت رکھتی تھی۔

"کیا اتنا بھی کوئی شکل و صورت میں کسی سے مل سکتا ہے۔" اس کا لباس اور انداز چیخ چیخ کر بزبان خود بتا رہے تھے کہ سماج کے کس گھٹیا طبقے سے اس کا تعلق ہے۔ وہ یقین کرکے بھی یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ دو تین مردوں کے نرغے میں گھری۔ بلند و بانگ قہقہے لگاتی۔ بے باک عورت۔

"نعیمہ۔" اس کے لبوں کی جنبش سے ادا ہونے والا لفظ اتنا ہی بے یقین تھا۔ جتنا وہ خود۔

"نہیں، وہ یہاں کہاں۔" انتہائی سرسری انداز میں سر جھٹک کر بھی وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھتے قدموں کو روک نہیں سکا تھا۔

"زریاب!" کسی جاننے والے نے اسے روک کر کوئی بات کی، لیکن اس کا دھیان اسی لڑکی کی سمت تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ، جم سی گئی تھی۔

وہ کہنے والے سے معذرت کرتا دو قدم آگے بڑھا اور اس نے اس کو دو قدم پیچھے ہٹتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنا خوف تھا۔ جتنا زریاب کے چہرے پر بے یقینی۔

زریاب کے قدموں میں تیزی آئی اور اس نے اس سے بھی زیادہ تیزی سے اس لڑکی کو پلٹ کر ہال سے باہر جاتے دیکھا۔

اماوس کی تاریکی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی اور اس کی ہولناکی اس کی باقی ماندہ زندگی نگلنے کو تیار بیٹھی تھی۔ کوئی بھی تو والی وارث نہ تھا اس کا۔ اس بڑے سارے شہر میں وہ اس پاک ذات کے بھروسے ہی تو آئی تھی۔ اس پر گزرنے والے حادثے کا علم رسولن کو ہو چکا تھا۔

فضا میں بلند ہوتی اذانوں کی آوازیں سنتی وہ بھڑے ہوئے کواڑ کو دھکیلتی اندر آئی، تو چارپائی پر پڑا شائل کا بے بس وجود اپنے اوپر گزری داستان کا بزبان خود گواہ تھا۔

"ہائے میں مرگئی۔" اس نے زور سے سینے پر دوہتڑ مارے اور بیگم کو بتانے بھاگی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی واردات نہیں تھی۔ سب جانتے تھے یہ مشہل کا کارنامہ ہے۔ گھر میں اس رات اس کے سوا کوئی نہ تھا۔

مسز رباب بذات خود چل کر اس کے کوارٹر تک آئیں، اس کی حالت دیکھی اور تسلی دی تھی کہ وہ مشہل سے خود جواب دہی کریں گی۔

اس محل نما گھر میں بسنے والے ملازمین ان پڑھ تھے یا جاہل مگر، پاگل یا بے وقوف ہرگز نہ تھے۔ سب ہی دیکھتے تھے کہ مشہل اسی آزادی کے ساتھ گھر کے اندر باہر آتا جاتا تھا جو بیگم رباب کی طرف سے اسے خاص طور پر ملی ہوئی تھی۔ کوئی بھی نہ تو بیگم رباب سے سوال کر سکتا تھا۔ نہ ہی ان کے ڈر کی وجہ سے مشہل کی طرف انگلی اٹھا سکتا تھا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے مشہل! اس لیے اتنی آزادی دی میں نے تم کو۔ اس دن کے لیے۔" معمولی سی سہی، لیکن تشویش تو مسز رباب کو بھی تھی کہ آنے والی نئی ملازمہ کے پیچھے زریاب کا حوالہ جڑا تھا۔

"خدا نہ کرے۔ اگر لانے والے کو اس کی خبر گیری کا خیال آگیا تو کیا جواب دوں گی میں اسے۔ تم جانتے ہو کون لایا تھا اسے۔ نہیں نا۔ وہ بھی نہیں جانتا کیا کھیل ہوتے رہتے ہیں یہاں۔"

"معافی دے دیں بیگم صاحبہ! بس اس رات بڑی بھول ہو گئی۔ میں، میں بھگتنے کو تیار ہوں۔ میں اس سے شادی کر لوں گا۔"

"چل بکواس نہ کر۔ تجھ جیسے ادھیڑ عمر گنوار سے تو میں کبھی اس کی شادی نہ کروں۔" مسز رباب نے ناک سکوڑ کر ناگواری سے کہا۔ مشہل نے بڑے صبر اور ضبط سے اس صاف گوئی کو برداشت کیا۔

"تو پھر اب میں کیا کروں۔"

"کرنا کیا ہے چپکا بیٹھا رہ اور کیا۔" انہوں نے بہت آرام سے اس کا قصہ نمٹایا تھا۔

"اور آئندہ اگر میں نے تجھے اس کے کوارٹر کے آس پاس بھی دیکھا نا تو ٹانگیں تڑوا دوں گی تیری سمجھا۔"

"معاف کردیں بی بی سائیں۔" وہ مکارانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر جانے کے لیے پلٹا۔

"اور سن۔" کچھ سوچ کر انہوں نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ برآمد کیا۔

"دل پشوری کے لیے اپنا ہی ٹھکانہ ملا ہے تجھے۔ آئندہ بھوک لگے تو باہر جاکے کھانا سمجھا کہ نہیں۔" انہوں نے نرمی سے کہتے ہوئے نوٹ اس کی جانب اچھال دیا۔ مشہل کے منہ سے دعاؤں کے پھول جھڑ رہے تھے۔ کہنے کی بات نہیں تھی، اپنے ملازموں کے لیے ہمیشہ سے نرم دل تھیں۔

☼ ☼ ☼

"باجی، اماں نے آپ کو بلایا ہے۔" محلے کی ایک بچی جو اس کے پاس ٹیوشن پڑھتی تھی۔ تیسری بار یہ پیغام لائی تھی۔

"کیوں بلایا ہے اور تمہاری اماں خود نہیں آسکتی کیا۔"

"ہوں ہوں۔ رشنا تمیز سے بول کیا، ہوتا جارہا ہے تجھے۔"

"مجھے کیا ہونا ہے چچی۔ آپ خود دیکھیں۔ یہ میرے پڑھانے کا ٹائم ہے۔ اب اس کی ماں کو کام ہے نا۔ وہ آکے مجھ سے بول دے۔ یہ کیا کہ اس کا کام اور میں جاؤں سننے کے لیے یہ سارا ٹبر چھوڑ کر۔" وہ بری طرح تنگ گئی تھی۔ چچی کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں۔

پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

اسے ملال نے گھیر لیا۔

اس قدر بدتمیزی سے تو وہ بہت ہی کم بات کرتی تھی، جب بہت غصے میں ہوتی یا اس کی برداشت جواب دے جاتی۔ اسے یاد آیا اب وہ اکثر اسی طرح چیخ و پکار مچانے لگی تھی۔ بہت جلد ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ شاید یہ عظمت بوا کے کھولے گئے بھید کا نتیجہ تھا۔ اس کے دل سے چچی کے لیے رہی سہی عزت بھی جاتی رہی تھی۔ اب اگر کوئی جذبہ موجود تھا تو وہ اس عمر میں اولاد کی جدائی سہنے کی وجہ سے صرف اور صرف ہمدردی کا جذبہ تھا۔ ورنہ وہ محبت اور عزت جو کبھی ان کے لیے وہ اپنے دل میں رکھتی تھی۔ شاید خیال و خواب ہی ہو گئی تھی۔ وہ نیند سے بوجھل آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارنے اٹھ گئی۔

اب یہ سب سوچنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ رویے بدل گئے تھے جذبات بدل گئے تھے۔ پر زندگی تو وہی تھی۔ سیاہ، بے رنگ، حبس، بوجھل۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے زریاب! یہاں کیوں کھڑے ہو اس طرح۔" وہ ہال کے استقبالیہ سے باہر آکر اس گاڑی کو نقطہ کی طرح معدوم ہوتا دیکھ رہا تھا۔ جس میں بیٹھ کر وہ تیزی سے چلی گئی تھی۔

پتا نہیں وہ نعیمہ تھی بھی یا نہیں اور اگر وہ نعیمہ نہیں تھی تو اس طرح گئی کیوں؟ جانے کب تک وہ وہیں کھڑا ان ہی سوچوں میں غلطاں رہتا، لیکن مسز رباب نے آکر اسے ہوش دلایا۔

"ہاں تھے، مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔" تیز روشنیوں میں اس کا جھلمل کرتا وجود، یہ محفلیں، یہ خوشبوئیں، یہ رنگ و بو کی ملاوٹیں دل کو لبھاتی اور نگاہوں کو گرماتی۔ سب جیسے اوجھل سا ہو گیا۔

"یہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا۔ وہ نعیمہ تھی۔ آپ جانتی ہیں اسے۔" اس کا انداز بھی اتنا ہی گم صم اور بے ربط تھا۔ جتنا کہ اس وقت وہ خود۔ مسز رباب کو اس کی غائب دماغی سے قطع نظر اس بات کی قطعی توقع نہیں تھی کہ وہ ان کی "لڑکیوں" میں سے کسی کو جان بھی سکتا ہے۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں ان کی سوچ تمام ممکنات اور غیر ممکنات کو کھنگال کر، ایک نتیجہ لے کر واپس پلٹی تھی۔

"ارے یہاں ہزار بارہ سو کی پبلک میں ایک لڑکی کا پوچھ رہے ہو۔" انہوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے ہنس کے جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا اور بات ٹالی۔ مگر وہ یونہی سنجیدہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔

"میں نہیں جانتی اس نام کی کسی لڑکی کو۔ ہو سکتا ہے وہ میرے کسی فرینڈ کے ساتھ آئی ہو۔ یو نو۔ یہ ینگ ٹین ایجرز یونہی پارٹیز انجوائے کرنے کے لیے کہیں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ کسی کا بھی ریفرنس لے کر۔" زریاب ابھی بھی دماغی طور پر پوری طرح وہاں حاضر نہ تھا۔ ورنہ ان کی بات کے بے تکے پن کو ضرور بھانپ لیتا۔

"کم۔۔۔ لیٹس انجوائے دا پارٹی۔"

وہ اس کا بازو تھام کر مسکراتی ہوئی اندر جا رہی تھیں۔ وہ کسی بے جان بت کی مانند کھنچا گیا۔

☼ ☼ ☼

اندھیری راتوں پر ڈراؤنے ہیولوں کی پرچھائیاں قابض تھیں۔

ایک بہت بڑے ہوس کے جن نے اس کی سینت سینت کر رکھی عمر بھر کی کمائی کو چند لمحوں میں ڈکار لیا تھا۔ سرد سرسراتی ہوا کی سرگوشیاں۔ اس کی برف سماعتوں میں پگھلتیں، راستہ ڈھونڈ ڈھانڈ بنجر آنکھوں سے بہہ نکلتیں۔ ایسے میں جو رسولن کی نظر پڑ جاتی تو بددعاؤں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، مٹھل کے لیے اس کے لبوں سے جاری ہو جاتا۔ وہ اس کی نسلوں اور پشتوں کو کوستی اور جی بھر گالیاں دیتی۔ شاہل اسے اپنی اولاد کی طرح پیاری ہو گئی تھی۔ وہ تھی بھی اتنے نیک اطوار کی لڑکی۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں بڑی سی اوڑھنی لیے۔ صبح سے شام کر دیتی مگر مجال ہے کوئی کام

اس کے ماتھے پر شکن تک لے آئے۔ سیدھے سادے انداز اور بھولا چہرہ۔

وہ اس کی شادی کے خواب بہت جلدی جاگتی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ سوچتی تھی بیگم صاحبہ سے بات کرکے، ان کے دوستوں یا جاننے والوں کے گھر کے کسی ملازم، ڈرائیور، مالی، خانساماں یا چوکیدار، کوئی بھی مناسب عمر کا آدمی دیکھ کر اس کا بیاہ کروا دے گی۔ لیکن واہ ری قسمت۔ غریبوں کو اتنے غریب خواب دیکھنے کی بھی اجازت نہیں کیا۔ بھلا کیا جاتا کسی کا، جو وہ بیاہ کے کسی کی عزت بن جاتی۔ اور بیگم صاحبہ وہ سب جانتے بوجھتے، آنکھیں اور کان، منہ بند کر کے بیٹھ گئیں۔ ٹھیک ہے اندر ہی اندر ان کا اور مٹھل کا معاملہ اور تھا۔ وہ ان کا خاص آدمی تھا۔ لیکن ایسی بھی کیا بے حسی۔ وہ مالکان اور ملازمین سب ہی سے شکوہ کناں تھی۔ لیکن اس سب کا فائدہ بھی کیا تھا۔ اس نے ایک ہاری ہوئی سانس کھینچی۔ گھٹنوں پر ہتھیلیاں ٹکا کے پورے جسم کا وزن ڈال کے کھڑی ہوئی۔ پھر دھیرے دھیرے چلتی اس کے سر پر پہنچی۔

"شاہل۔ اے شاہل۔ دوا کھائی تو نے؟۔" اس کی بے جان آنکھوں میں لمحے بھر کو زندگی جاگی۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر وہ آسمان تکنے لگی۔ رسولن کے سینے میں ایک ماتم برپا تھا۔

☼ ☼ ☼

محفل کی جوانی اپنے عروج پر تھی۔ وہ سارا وقت مسز رباب کی خاص نظر کرم کے حصار میں تھا۔ وہ اسے لیے لیے ساری محفل میں یہاں سے وہاں پھر رہی تھیں۔ اور لوگوں میں اسے اپنا بھتیجا کہہ کر متعارف کروا رہی تھیں۔ زریاب نے جو کچھ، چند لمحے پہلے دیکھا وہ اگر بہت زیادہ اثر پذیر تھا بھی تو، اب اتنے بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے کے لیے اسے سر سے جھٹکنا ہی پڑا تھا۔ اب وہ شوخ و چنچل لڑکیوں کے ایک غول کے پاس کھڑی، ان سے زریاب کے بارے میں بے باک کمنٹس سن کر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

تب ہی ان کے موبائل کی بیپ نے ان کی توجہ کچھ دیر کو سب طرف سے ہٹا دی۔ بڑے انداز میں انہوں نے سیل کان سے لگا کے ہیلو کہا تھا۔ مگر دوسری طرف جانے کون تھا۔ پل بھر میں ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"واٹ۔ اونو۔ مائی گاڈ۔" آس پاس کھڑے سب ہی لوگ ان کے انداز پر ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ "او کے۔ او کے۔ میں آ رہی ہوں۔ آئی ایم کمنگ۔"

بہت جلدی میں انہوں نے سیل بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"زریاب! میری ایک بہت قریبی دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔" زریاب کے ذہن میں فوراً" گاڑی لے کر وہاں سے نکلتی لڑکی گھوم گئی۔ "میں آپ کو لے چلوں اپنے ساتھ۔"

"ہاں۔" اب کے انہوں نے اپنی گھبراہٹ سنبھال کے اسے دیکھا۔

"نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں، میں چلی جاؤں گی۔ تم پارٹی انجوائے کرو ہاں۔" وہ اس کا گال تھپک کر تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔

زریاب نے محض کچھ ہی منٹ ان کے جانے کے بعد وہاں لگائے۔ "یہ کون قریبی دوست تھی جو اس گرینڈ فنکشن میں مدعو نہیں کی گئی۔ اس کی گاڑی مسز رباب کی گاڑی کا پیچھا کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کتنی دیر گزر گئی تھی۔ ٹھنڈے ٹھار صحن کا طول و عرض ناپتے۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس رات جیسی سیاہی میں اسے تن تنہا چھوڑ دینے والی ماں نے اس کے ساتھ چپ چاپ یہ کھیل کھیلا ہو گا۔ شاید بوا نہ بتاتیں تو وہ زندگی بھر جان ہی نہ پاتی۔

میں اور زریاب کی بہن۔

اف! شرمندگی اور اذیت میں تہہ در تہہ لپٹی حقیقت تھی۔ یقیناً" زریاب کے اندر اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں بچی ہوگی۔ جب ہی چپ چاپ اپنا گھر بیچ کر دونوں بہنوں کو لے کر یہاں سے منتقل ہوگیا تھا۔ پہلی بار تو اسے سن کر بھی یقین نہیں آیا تھا۔

"لو آج کی بہ بانگ نیوز سنی تم نے۔"

"کیا" وہ بے دلی سے باسی روٹی کے ٹکڑے ناشتے میں چائے کے ساتھ نگل رہی تھی۔

"زریاب کہیں چلا گیا اپنا گھر بیچ کر۔"

اس کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی۔ نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ "کہاں چلا گیا؟"

"کیا پتا۔" نمو ایسی بن گئی جیسے اسے کچھ پروا نہیں۔ مگر وہ جانتی تھی۔ اندر ہی اندر متفکر تو وہ بھی ہوگی۔

"تو ایسے کیسے جا سکتا ہے۔ بنا بات کیے بغیر کچھ بتائے۔"

"کیوں نہیں جا سکتا۔"

"ارے اتنی بڑی حرکت ہم سے ملے بتائے بغیر وہ کر ہی نہیں سکتا۔ کھانے کو پیسے نہیں ہیں اس کے پاس، وہ کیا پاگل ہے جو گھر بیچے گا۔" وہ اسے جھٹلاتے ہوئے خود بھی یقین نہیں تھی۔

"چلو۔ دیکھتے ہیں۔" نمو نے کندھے اچکا دیے۔

اس کی نمازوں میں پابندی اور سجدوں میں طوالت آگئی۔ لیکن جانے والا پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ انتظار کی گھڑیاں اتنی لمبی ہوگئیں کہ کئی سال گزار کر بھی مختصر نہ ہو سکیں۔

یہی صحن تھا۔ جہاں وہ زریاب کو سوچوں میں بسائے تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ یہاں سے وہاں اور آج اسی صحن میں صحراؤں کی سی وسعت اتر آئی تھی۔

اماوس کی تاریکی میں جاگتا ہوا ریگستان۔ اس کی زندگی کی طرح۔ جہاں نہ کوئی سمت تھی نہ روشنی۔ نہ ہی کوئی اندازہ نہ ہی کوئی کنارا۔

☼ ☼ ☼

مسز رباب اسپتال کی ایمرجنسی کی طرف جا چکی تھیں۔ وہ ریسپشن کی طرف بڑھ گیا۔

یہ کوئی بہت بڑا اور نامور اسپتال نہیں تھا۔ اسے جلد ہی تمام معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ اس کا خدشہ ٹھیک ہی تھا۔ وہ لڑکی اپنی بوکھلاہٹ اور تیز رفتاری کے باعث حادثے کا شکار ہوگئی تھی۔

"یا اللہ۔" جانے کون کون سے واہموں نے اچانک ہی اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"وہ جو بھی ہے۔ بس نعیمہ نہ ہو۔" اس کے لب قرآنی آیات کا بے آواز ورد کر رہے تھے۔ وہ واپس جا کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسپتال میں وہ مسز رباب یا ان کے ایسے کسی بھی جاننے والے کی نظروں میں آسکتا تھا جو اسے جانتے تھے اور مسز رباب سے اس کے کسی بھی قسم کے تعلقات سے آگہی رکھتے تھے۔

صرف ایک موہوم سے خدشے اور بے پناہ مشابہت نے اس کی نیند اجاڑ کے رکھ دی تھی۔ وہ ساری رات اس نے وہیں گاڑی میں جاگ کر گزار دی تھی۔ اور اس وقت تک اس کی خبر لیتا رہا۔ جب تک اس کی حالت خطرے سے باہر ہونے کی نوید نہ مل گئی۔

اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ ذہن میں اودھم مچاتے سوالوں کی تعداد اتنی زیادہ اور نوعیت اس قدر گمبھیر تھی کہ وہ اپنے آپ کو ان کے جوابات کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

صبح کے اجالے کے آثار تھے۔ جب اس نے جلتی آنکھوں کو زور سے میچ کر کھولا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ اسے اس وقت بدین کے لیے نکلنا تھا۔ صبح آفس کی چھٹی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"مس رشنا! میں نوٹ کر رہی ہوں۔ اسٹارٹنگ میں آپ ایک ایکٹو اور انرجیٹک ٹیچر ہوتی تھیں۔ لیکن اب بتدریج آپ کے رویے میں چینج آرہا ہے۔ کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔" وہ اس پیشی کے لیے تیار نہیں تھی۔ ابھی پہلا پیریڈ بھی شروع نہیں ہوا تھا اور اسے پرنسپل کے آفس میں کال کرلیا گیا تھا۔

"اور جانتی ہیں۔ کتنی کمپلینٹس آچکی ہیں۔ پیرنٹس کی طرف سے آپ کی۔" وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔

"دیکھیے اگر آپ کو کوئی پرابلم ہے۔ اسکول میں یا گھر میں یا ـــ کوئی بہت پرسنل پرابلم بھی ہے تو آپ ایک دوست سمجھ کر میرے ساتھ شیئر کر سکتی ہیں۔" پرنسپل بہت کوآپریٹو تھیں۔ وہ اسے بہت نرم انداز میں سمجھاتی رہیں۔

"سوری میم آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

اس نے وہ واحد بات ان کے سامنے کی۔ جسے کہنے کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

رات بھر جاگنے کے باعث اس سے آفس میں کام نہیں کیا گیا۔ بے پناہ سر کے درد نے اس کی حالت خراب کروالی تھی۔ آئمہ کے زور دینے پر ـــ آفس ٹائمنگ سے پہلے ہی گھر آنا پڑا۔

اس نے گھر آکے آئمہ کو فون کر کے دو دن لیو کے لیے کہہ دیا تھا۔ کیونکہ سخت ترین ذہنی مشقت کے بعد وہ اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ اپنے آپ کو کسی بھی قسم کے دماغی کام کے لیے تیار نہیں پا رہا تھا۔ گوکہ یہ دو دن کی چھٹی اس نے ذہنی اور جسمانی آرام کے لیے لی تھی۔ اور فون کر کے رابعہ کو کراچی سے اپنے پاس بدین بھی بلوالیا تھا۔ مگر یہ دو دن الٹی سیدھی سوچوں نے اس کے گرد گھیرا بنائے رکھا۔

وہ لڑکی جو بھی تھی نعیمہ کی یاد دلا گئی تھی۔ اور اگر وہ نعیمہ ہی تھی تو بھلا وہاں کیا کر رہی تھی۔ اس کا حلیہ اور انداز پکار رہے تھے۔ جس جگہ سے اس کا تعلق تھا۔ مسز رباب نے اسے پہچاننے سے انکار کیوں کیا تھا۔ بعد میں وہ اسے اپنی قریبی دوست بتانے لگی تھیں۔ اگر وہ ان کے پیچھے نہ جاتا تو شاید یہ بات اس سے پوشیدہ ہی رہ جاتی۔ اس کا سر دکھتا ہی رہتا۔ انگلیوں کے بیچ سگریٹ سلگتی رہتی۔ نگاہیں خلا میں بھٹکتی رہتیں۔ اسے ایک رازداں کی ضرورت تھی۔ ایک دوست کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ ایک دم سے کسی پر اعتبار کرے تو کیسے۔

☼ ☼ ☼

"ایک بندہ آنے والا ہے تو ایسا کر شاہل کو کچن سے نکال۔ میں اس کے لیے کپڑے بھجوا رہی ہوں۔ ذرا ڈھنگ سے کنگھی چوٹی کر کے اوپر کی منزل پر بھیج دینا۔" وہ رسولن سے بڑی مصروفیت میں بات کر رہی تھیں۔

رسولن کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ مگر وہ اپنے فون میں مصروف دیکھ نہیں پائیں۔

"اب دیکھ کیا رہی ہے کھڑی کھڑی۔ جا جلدی کر۔ ابھی آتا ہوگا۔" وہ بدقت پلٹی اور شاہل کو بڑی بی بی کا پیغام سنانے چل دی۔ اس سے کسی بھی قسم کی ہمدردی رکھنا۔ اپنے ہی جی کو روگ لگانے کے برابر تھا۔ یہ کھیل تو یہاں چلتے ہی رہتے تھے۔ کون اس کھیل میں کس طرح اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اس کی قسمت۔ شاہل ناسمجھی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر باہر چل دی۔

رسولن ایک بار بھی اس سے نظر نہیں ملا پائی تھی۔ اور وہ خود تو نہیں مگر رسولن جانتی تھی اب وہ اس سے بھی نظر ملانے کے قابل نہیں رہے گی۔ بڑی بیگم صاحب کو اسپتال جانا تھا۔

یہاں داخل ہونے والی لڑکی "نوما" جسے مشھل کے ذریعے بیگم صاحبہ نے سدھایا تھا۔ اب خطرے سے باہر تھی۔ اور کچھ ہی دن میں ڈسچارج ہو کے گھر آنے والی تھی۔

"بچ گئی بدبخت۔ اپنی زندگی بھی باقی اور آزمائش بھی۔" ہر لڑکی اس کے لیے "دہی رانی" تھی۔ اور گھر والوں کے لیے "مال" بولی لگنے والا۔ خریدار اور بیچا جانے والا مال۔

☼ ☼ ☼

اسکول میں اس کی کارکردگی پہلے سے بہتر ہونے لگی تھی۔ سردیوں کا اختتام تھا اور بہار کی آمد آمد تھی۔ سدا

بہار کا پودا بنجر پڑا تھا۔ اس کی زندگی کی طرح۔

چچی کی حالت البتہ قدرے بہتر تھی۔ یوں بھی سردیوں میں ان کا سانس کا مرض زور پکڑ لیتا تھا۔ پھر موسم بدلنے کے ساتھ اس میں بہتری کے آثار آنے لگتے۔ اب وہ اس کے اسکول سے واپس آنے تک کھانا پکا کے رکھ چکی ہوتی تھیں۔ گھر بھی صاف ستھرا ملتا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے دل میں شکر گزاری کے جذبات زور پکڑ لیتے۔ وہ ضعیف تھیں۔ بیمار تھیں۔ مگر حتی المقدور اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔ اس کی چڑچڑاہٹ البتہ اپنی جگہ قائم ودائم تھی۔

سالانہ امتحانات کے اختتام پر اسے ایک نئی استاد کی حیثیت سے بہتر کارکردگی دکھانے پر انعام ملا۔ یہ انعامی سلسلے اسکول کی پرنسپل کی طرف سے شروع کیے گئے تھے۔ تاکہ ٹیچرز اپنی پرفارمنس کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

گو کہ اس مقابلے میں وہ تیسرے نمبر پر ہی آسکی تھی۔ مگر تمام اسٹاف، اسٹوڈنٹس اور خود اس کے لیے یہ انعام اس لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اسے یہ نوکری شروع کیے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔

یہ انعام ایک عدد سرٹیفکیٹ اور کچھ نقد رقم پر مشتمل تھا۔ اس نے پرنسپل سے وصول کرتے وقت اپنی آنکھوں کو نم محسوس کیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ زریاب کو اس وقت اتنی شدت سے یاد کررہی ہے کہ اسے لگ رہا ہے کہ وہ آس پاس ہی کہیں موجود تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

دو مہینوں کی لگاتار ڈیوٹی کے بعد آج یہ چھٹی اور آرام کا دن نصیب ہوا تھا۔ سال کے اختتام پر شروع ہونے والا کلوزنگ کا کام نئے سال کی پلاننگ کے ساتھ دو مہینے گھسیٹ لے گیا۔

اوپر سے اس کی الجھی ہوئی ذہنی حالت کے ہاتھوں، رپورٹس اور فیگرز میں بار بار ہائی لائٹ ہونے والی غلطیاں۔ آئمہ تک سخت عاجز آگئی تھی۔

اس کے ذہن سے وہ لڑکی، اس کا ایکسیڈنٹ اور رباب آنٹی کا جھوٹ نکالے نہیں نکل سکا۔ ایک دوبار فون پر اس نے باتوں باتوں میں ان سے ان کی دوست کی خیریت معلوم کرنا چاہی تو انہوں نے بہت سرسری سا جواب دے کر موضوع ہی بدل دیا۔

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ پلیز تم مائنڈ مت کرنا زریاب۔" کلوزنگ کے اینڈ پر سلا ویک اینڈ گھر میں آرام کرکے جب وہ صبح آفس آیا تو طبیعت قدرے بہتر تھی۔

"ہاں بولو ناں۔ اتنی فارمل کیوں ہو رہی ہو۔"

"میرا خیال ہے، تمہیں شادی کرلینی چاہیے۔" وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگئی۔ مگر زریاب جانتا تھا، وہ ابھی کچھ اور بھی کہنے والی ہے۔

"شکریہ۔ آئمہ! تم ––– بہت اچھی ہو۔ اور میں تمہارا مشورہ ضرور مانوں گا۔ بہت جلد تم کوئی اچھی خبر سنوگی۔"

اس کے ذہن میں کسی کا چہرہ تروتازہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا آئمہ بے خبر ہے۔ اور اتنی آسانی سے یہ بات قبول نہیں کرے گی۔ مگر اسے اپنے فیصلے پر عمل کرنا تھا۔

کسی کی زندگی اس کے محض ایک قدم سے سنور سکتی تھی۔ تو وہ یہ قدم اٹھانے کے لیے تیار تھا۔

یوں بھی اس کا دل اپنے جذبات کو کسی کے لیے گروی رکھ چکا تھا۔ اب اس کی شریک حیات کوئی ایسی لڑکی ہونی چاہیے تھی۔ جو دل کے علاوہ اس کی طرف سے دی جانے والی ہر چیز کو اپنے لیے کافی سمجھے۔ جس کے لیے زریاب کا وجود، اس کی توجہ اور احساس ذمہ داری اتنا کافی ہو کہ وہ اس سے محبت کی طلب نہ کرسکے۔

اور ایسی لڑکی۔ ایسی لڑکی تھی۔ اسے مل بھی سکتی تھی۔ اس نے اپنے ارادے پر پختگی کی مہر لگائی۔ اسے جلد سے جلد کراچی جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دو بخت کی سیاہی پھیل کر کالک کی طرح منہ پر بھی مل جاتی ہے رسولن۔ تجھے کیا پتا۔" اس کا رندھا ہوا گلا۔ دل کی تکلیف کا آئینہ تھا۔

"زندگی کتنی تکلیف دہ چیز ہے۔ کیوں ہے یہ ایسی۔ میرے لیے کیوں ہوگئی۔" آنسو اس کے رخساروں پر پھسلتے جارہے تھے۔ رسولن کے دل کو جیسے کسی نے مسل ڈالا تھا۔

"پہلے سیلاب میں میرے گھر والے ختم ہوگئے۔ ایک باپ تھا وہ بھی چھوڑ گیا۔ کیا تھا میرے پاس ایک عزت کے سوا۔ سارے جہان سے بچائی چھپائی میں ادھر سے ادھر بھاگتی پھری۔ اور جہاں آکر چھت ملی تو وہ ہی میری چادر کو سر سے کھینچ لے گئے۔" بے بسی کے شدید احساس تلے، وہ رو پڑی تھی۔

"میں مری کیوں نہیں رسولن، مر کیوں نہیں گئی میں۔" رسولن نے بڑھ کے اسے سینے سے لگالیا، وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بڑی تیزی سے امپروو کیا تم نے ––– ویل ڈن۔ میں تو بہت ڈر گئی تھی۔" مسز رباب بہت خوش تھیں۔ ان کا مخاطب نعیمہ تھی۔ "جب تمہارے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی۔ میرے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔ جب تمہیں ٹھیک سے ڈرائیونگ نہیں آتی تو کیا ضرورت تھی یوں گاڑی لے کر نکلنے کی۔"

وہ خاموشی سے سامنے رکھی ٹرے میں سے ڈبل روٹی کا پیس اٹھا کے کتر رہی تھی۔

"آئندہ سے کوئی تنگ کرے یا کوئی پرابلم ہو تو مجھ سے کہنا۔" اس کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر سے رواں ہوگئے۔

"اس طرح کا رسک لینے کی ضرورت نہیں۔" وہ اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر اندر ہی اندر بہت بل کھا رہی تھیں۔

"خدا نہ کرے۔" انہوں نے ایک انداز سے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا۔ "اگر تمہیں کچھ ہوجاتا۔ فرنٹکلی۔ اینی ٹائپ آف سیریس انجری تو پھر۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کے چہرے پر ابھرتی کڑوی مسکراہٹ دیکھی۔

"اور کچھ نہیں تو تمہارے فیس پر ہی کوئی مارک آجاتا تو، مائی گاڈ۔ آئی کانٹ افورڈ۔"

کھلی کھڑکی سے چھن کر آتی دھوپ کمرے میں درجہ حرارت بڑھا رہی تھی۔ روشن، کھلا کمرہ، صبح کا وقت اور گرما گرم ناشتہ۔ طبیعت کو بہلانے کے لیے ایک بڑا ہی خوش خیال منظر سامنے تھا۔ لیکن مسز رباب اور ان کی بناوٹی باتیں، اس کی برداشت کو مسلسل آزما رہی تھیں۔

"تم نہیں جانتی ہو، کتنا خوفناک ایکسیڈنٹ تھا۔ گاڑی کا قیمہ بن گیا۔ کوئی مریکل (معجزہ) ہی تھا کہ تم بچ گئیں۔ ورنہ جان بھی جاسکتی تھی تمہاری۔"

انہیں اندازہ تھا، وہ جب سے کمرے میں آئی ہیں۔ خود ہی بولے جارہی ہیں۔ مزید بک بک کرنا فضول لگا تھا۔

"خیر میں تو یہ بتانے آئی تھی۔ تمہاری سیٹ کنفرم ہوگئی ہے۔ پرسوں تم یہاں سے دبئی فلائی کررہی ہو۔" وہ بات سمیٹ کر اٹھ گئیں۔

"آنٹی!" اتنی دیر میں یہ پہلا لفظ اس وقت اس کے منہ سے نکلا جب وہ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ چکی تھیں۔ "پلین کریش ہوجائے تو سب مرجاتے ہیں ناں۔ اس میں تو کوئی بھی زندہ نہیں بچتا۔" اس کی آواز بڑی پراسرار تھی۔ اس کی مسکراہٹ کی طرح۔

مسز رباب کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے ایک ڈیلی گیشن کے ساتھ، دبئی ہیڈ آفس وزٹ کے لیے بھیجا جارہا تھا۔ وہ خود تو خوش تھا ہی۔ آئمہ بھی اس کی خوشی میں برابر کی شریک تھی۔ دیگر اسٹاف اور یہاں تک کہ فضل دادکی طرف سے بھی، اسے مبارکباد موصول ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ این جی او کے مینجمنٹ ڈپارٹمنٹ سے تعلق نہ رکھنے

کے باوجود اس وفد میں شامل کیا گیا۔ جس میں سب ہی شرکا سے دو یا تین گنا زیادہ اسکیل کی پوسٹ پر تھے۔ اور این جی او کے مینجمنٹ کے اہم ارکان سمجھے جاتے تھے۔ اپنے سینئرز کے ساتھ ' بیرون ملک کا دورہ اس کے لیے ایک ایسا خواب تھا۔ جو بن دیکھے ہی تعبیر بن گیا۔

آئمہ اس کے چلے جانے سے اداس تو تھی۔ لیکن مستقبل میں اس اقدام سے جڑی جو پروموشن زریاب کی منتظر تھی اسے ملنے کی خوشی اس اداسی پر غالب آگئی تھی۔ اس نے خود زریاب کے ساتھ جاکے اس ٹور کے لیے شاپنگ کی تھی۔ گھنٹوں بازار میں اس کے کپڑوں کی سلیکشن کے لیے خوار ہوئی تھی۔ اس ٹرپ سے پہلے آئمہ کے ساتھ گزارا ٹائم اس نے حقیقتاً بہت انجوائے کیا تھا۔ اور وہ وقت اس کے لیے یادگار بن گیا تھا۔

اپنے دبئی جانے سے پہلے وہ رابعہ اور خاص طور پر شاہل سے ملنے کراچی آیا۔ رابعہ کو بھی اس کے جانے کی خبر سن کر خوشی ہوئی۔ رباب آنٹی تو گھر پر نہ ملیں۔ مگر شاہل کو اس نے دور سے ہی کوارٹر کے پاس کھڑے دیکھ لیا تھا۔ اسے شاہل کو دیکھ کر ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔

وہ بہت بدل گئی تھی۔ شاید سر سے پاؤں تک ہی۔

گولڈن ڈائی کیے ہوئے بال اس قدر مختصر تھے کہ کس کے باندھی گئی پونی ٹیل کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے کاٹن کا ایک بہت اچھا سوٹ پہنا ہوا تھا' جو اس کی شخصیت پر بالکل سوٹ نہیں کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر شوخ رنگ کی لپ اسٹک کی گاڑھی تہہ جمار کھی تھی اور پیر چپل کی قید سے آزاد تھے۔ یوں لگتا تھا' کسی نے گاؤں کی دیہاتن کو شہری گیٹ اپ دینے کی کوشش کی ہو۔ اس کے گہرے سانولے رنگ پر نہ وہ چبھتے ہوئے رنگ کا عمدہ کاٹن کا سوٹ اچھا لگ رہا تھا اور نہ ہی وہ میک اپ۔ اور نہ ہی بے دردی سے کتر دیے جانے والے سنہری بال۔

اس کے حلیے سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نے زریاب کو آتے دیکھا تو بھاگ کر کوارٹر میں چلی گئی اور کمرے کا دروازہ سختی سے بند کر دیا۔ زریاب نے دو تین بار دروازہ کھولنے کو کہا۔ مگر وہ اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ ہار مان کر وہ وہاں سے واپس چلا آیا۔

"یہ ایسی کیوں ہو گئی۔ اسے مجھ سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ اسے کیا ضرورت تھی اس طرح کا حلیہ اپنانے کی۔۔۔ کیا کسی نے اسے مجبور کیا تھا۔" سوالوں کا ایک ہجوم لگا تھا اس کے دماغ میں اور جواب۔۔۔!

☼ ☼ ☼

دو ہفتے ڈیلی گیشن کے ساتھ آفس ورک میں لگے۔ اس کے بعد آخری ہفتہ انہیں گھومنے پھرنے اور سیر و تفریح کے لیے دے دیا گیا۔ مسلسل ایک ہفتے کے آرام اور نئی اور انجان جگہ کی سیر اور تفریحی پروگراموں نے اس کی طبیعت اور مزاج پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔

اپنے آفیسرز کے ساتھ آفس کے مخصوص ماحول سے نکل کر دوستانہ انداز میں گھومنے پھرنے اور خاص طور پر اوور نائٹ فنکشنز اٹینڈ کرنے میں اسے بہت مزا آیا اس سارے ٹور میں ایک ذرا سا جو افسوس ناک پہلو تھا۔ وہ اس وقت سامنے آیا جب اس نے نائٹ پارٹیز میں اپنے کولیگز کو پینے پلانے کا شغل کرتے دیکھا۔ غیر ملکی حسیناؤں' جو خاص کر ان ہی کی دل لگی کے لیے بلوائی گئی تھیں' ان کی بانہوں میں جھولتے' ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے دیکھا۔

یہ رات ان کی دبئی میں آخری رات تھی۔ کل سہ پہر کے وقت ان کی پاکستان کی فلائٹ تھی۔ وہ افسوس بھری نظروں سے اپنے آفیسرز کو ان دو ٹکے کی عورتوں پر نثار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے ملک میں ایک نام' ایک پہچان رکھتے تھے۔ اور بہت باعزت روزگار سے منسلک تھے۔ اس نے ایک گہری سانس بھر کے ان بوجھل سوچوں کو اپنے قریب آنے سے روکنے کی خاطر' ہال میں اس طرف نظر ڈالی' جہاں نوعمر' شوخ اور بے باک لڑکیوں کا ایک گروپ مستیوں میں مصروف تھا۔ آنکھوں کو سینکنے کی حد تک تو اس نے بھی بے ایمانی کرلی تھی۔ بڑی فرصت سے مسکراتے ہوئے ان چمکتے ہوئے چہروں اور نازک ڈال کی طرح لچکتے جسموں کو دیکھے گیا۔ وہ خود چونکہ دوسرے مردوں کی طرح ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں ہوا تھا۔ اور اس وقت ہال میں قدرے الگ تھلک بیٹھا تھا اس لیے جلد ہی ان کی نظروں میں آگیا۔

وہ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانے اور بلانے لگیں۔ اسے ایک دم سے ہنسی آگئی۔ اور وہ یونہی ہنس کے اپنا منہ پھیر لینا چاہتا تھا مگر ایسا کر نہیں سکا۔ اسی گروپ سے ایک لڑکی نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سکڑی اور جسم و جاں میں بجلی سی بھر گئی۔ لمحے سے بھی کم وقت میں وہ اڑتا ہوا اس لڑکی کے سر پر جا پہنچا تھا۔ جو خود برق رفتاری سے وہاں سے نکل رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تھا۔

"لیوی۔" وہ پلٹ کر درشتی سے بولی۔ اس کی مصنوعی رنگوں والی آنکھوں میں پہچان کے رنگ بالکل اصلی تھے اور وہ تو حیرت اور صدمے سے ایسا گنگ ہوا کہ اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا۔

"آئی سیڈ۔ جسٹ لیوی۔" پہلے سے زیادہ سختی سے بولی۔

"ہو آر یو!" زریاب کا لہجہ بے انتہا سرد تھا۔

"ڈیٹس نن آف یور بزنس۔" وہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"نعیمہ۔" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ "کیا کر رہی ہو تم یہاں۔" وہ زیادہ دیر تک برف نہیں رہ سکتا تھا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" اس نے جھنجھلا کر اپنا بازو چھڑایا مگر' وہ زریاب کی سخت گرفت میں تھا۔

"او یو۔۔۔" اس کے منہ سے ایک گالی نکلی۔

"چھوڑو مجھے" اس نے پھر مزاحمت کی۔ "چھوڑو مجھے زریاب! پلیز۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا اور اس کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ زریاب کے ہاتھ سے اس کا بازو چھوٹ گیا۔ شاید وہ اب تک کسی انہونی مشابہت یا نظر کے دھوکے کا خواہش مند تھا۔ بے ہنگم تیز میوزک' لوگوں کی آوازیں' باتیں' قہقہے' سب ایک لمحے کے دکھ میں اپنی حقیقت کھو بیٹھے۔ بے یقینی کے ایک گہرے حصار میں صرف وہ دونوں کھڑے رہ گئے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ باقی سب معدوم ہو گیا۔

چند لمحوں بعد اس کی نیلی ـــــ آنکھوں میں نمی ابھری اور اس نے پلٹ کر اسے ہال سے باہر جاتے دیکھا چند لمحوں پہلے جب وہ دوڑ کر ہال سے باہر جا رہی تھی تو وہ' اس سے زیادہ تیز رفتاری سے اس کے پاس جا پہنچا اور اب جبکہ اس کے قدم نڈھال اور شکستہ ہو چکے تھے۔ زریاب کو اسے روکنے یا اس کے پاس جانے کی کوئی خواہش نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑا بہت ابہام تھا سو' دور ہوا۔

وہ نعیمہ ہی تھی لیکن' کیوں تھی۔۔۔ یہاں کیوں تھی۔ وہاں کیوں نہیں تھی۔ جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔

باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار بھی پلٹ کر زریاب کو نہیں دیکھا۔ زریاب بھی شاید یہی چاہتا تھا اب' وہ مڑ کر کبھی نہ دیکھے۔

☼ ☼ ☼

نیم روشن کمرے میں خنکی اور خاموشی کا راج تھا۔ بہت زیادہ رو چکنے کے بعد آنکھوں میں شدید جلن اور سوزش پیدا ہو گئی تھی۔ سیاہ ٹاپ لیس ریشمی میکسی اس کے گھٹنوں پر سے سمٹ کے صوفے پر دائیں طرف پڑی تھی۔ گوری سڈول ملائم پنڈلیاں ایک دوسرے پر دھری تھیں اور عریاں بازو دائیں بائیں بے ترتیبی سے گرے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ میں سگریٹ تھی اور بائیں ہاتھ میں تھا گلاس اس نے صوفے پر ہی لڑھکا دیا تھا۔ دھواں دھواں ہوتے ماحول میں کتنے ہی

چہرے سامنے بنتے بگڑتے جا رہے تھے۔

"ارے کچھ پہن تو لے پاؤں میں۔ نہیں تو ٹھنڈ بیٹھ جائے گی۔" یہ چہرہ اس کی ماں کا تھا۔

"دیکھو کیسے کھوں کھوں کر رہی ہو۔ امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ تمہیں اپنی بالکل پروا نہیں۔" اس کی ماں جائی تھی۔ جس کے ساتھ اس نے کتنی بڑی زیادتی کی تھی۔ ہمیشہ کے لیے اس کو تنہا کر ڈالا تھا۔

"تم میرے لیے بالکل بہن جیسی ہو نعیمہ۔ حیرت ہے تم نے میرے بارے میں اس طرح کیوں سوچنا شروع کر دیا۔" یہ بھی ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ ایک شناسا چہرہ۔ ایک محبوب چہرہ۔ دل نے ایک سسکی لی۔ دھویں کے بنتے مٹتے مرغولوں میں کتنے ہی چمکتے، بجھتے روشن، مکروہ بھیانک چہرے اس کے سامنے تھے۔

"بے فکر رہو۔ آئندہ تمہارا سامنا مٹھل جیسے کسی شخص سے نہیں ہو گا۔" ایک مجرم کا چہرہ۔

"لے۔ تو پہلے بتا دیتی۔ میں تیرے لیے پہلے دن ہی گجرے لا دیتا۔" مکروہ، موقع پرست، مطلبی چہرہ۔

"خبردار! جو آواز نکالی۔ ٹوٹے کر دوں گا ٹوٹے۔"

موٹی موٹی سرخ آنکھوں والا بھیانک چہرہ۔

سگریٹ کا سرخ شعلہ جلتا ہوا انگلیوں کے سرے تک پہنچ گیا۔ اس نے بے خیالی میں اسے جھٹکا۔ اٹھ کر کھڑکی تک پہنچی اور دور دور تک پھیلے منظر کو دیکھنے لگی۔ اسے یقین تھا، وہ آج آخری بار یہ دنیا دیکھ رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک بار پھر شاہل کے روبرو تھا۔ کتنے دن لگے تھے اسے۔ شاید چند ہفتے یا مہینے۔ دبئی سے ڈیلی گیشن کے ساتھ واپسی پر اس کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر تھی۔

آفس ورک کو پورے دھیان سے نمٹانے کے باوجود آئمہ کو دکھا کر اطمینان کرنا ضروری ہو جاتا کہ اس میں کوئی غلطی نہیں ہے اور ہر بار ہی کوئی نہ کوئی غلطی اس کا منہ چڑا رہی ہوتی۔

"مجھے کراچی جانا ہو گا۔" اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

مگر چھٹیاں ملنے میں تاخیر ہوتی گئی اور اس کی بے تابی بڑھتی گئی۔ مگر اس نے کراچی آ کے دم لیا۔ آنے سے پہلے رباب آنٹی کو مطلع کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ چاہتا تھا، وہ ان کی غیر موجودگی میں شاہل سے ملے اور اس کی یہ احتیاط بے کار نہیں گئی تھی۔ وہ اس کے مدمقابل سر جھکائے بیٹھی تھی۔ حلیہ وہی تھا مگر چہرہ سپاٹ۔

"تم بہت بدل گئی ہو۔" اس نے دھیرے سے سر ہلایا۔

"کیا ضرورت تھی یہ بدلی انداز اپنانے کی۔" اس نے سر نہیں اٹھایا۔

"اور مجھے رسولن نے بتایا۔ تم اردو بہت صاف بولنے لگی ہو۔ کس نے سکھائی تمہیں۔" زریاب کو اس کی خاموشی سے الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بڑے سے دوپٹے کو چاروں طرف لپیٹا ہوا تھا۔

"میں تم سے ایک بات کرنے آیا ہوں۔ پتا نہیں تمہیں کیسی لگے۔ شاید بری یا بہت عجیب، مگر میرے لیے یہ بات بالکل عجیب نہیں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے اور تمہید کہاں پر ختم کرے۔ جس کام کو، جس بات کو وہ بہت آسان سمجھ رہا تھا وہ، اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ ایک کم صورت، گنوار، غریب، لاوارث لڑکی سے نکاح کی خواہش۔ یقیناً" بہت لوگوں کی نظر میں ناقابل معافی ہوتی۔

"شاہل میں۔۔۔" اس نے رک کر گلا کھنکھارا۔ اس کا جھکا ہوا سر اب تک نہ اٹھا تھا۔ "مجھ سے شادی کرو گی تم۔ میں۔۔۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے وجود میں جنبش نہیں ہوئی۔ جس حیرت کی توقع وہ اس سے کر رہا تھا۔ وہ خود اسی کے چہرے پر چمکنے لگی۔

اس نے اپنا جھکا سر اٹھا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کیا تھا ان آنکھوں میں زریاب کو اپنے وجود میں بے چینی سی ہونے لگی۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔

چلو گی میرے ساتھ۔" اس نے پھر سر جھکا لیا۔

"کتنے دن کے لیے صاب!" اس کا جواب اس کی توقعات سے قطعی مختلف تھا۔

"کیا مطلب کتنے دن کے لیے۔" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔ "شادی کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں تم سے۔" اس نے شاہل کو اپنی بات سمجھانا چاہی۔

"کیا کرو گے شادی کر کے صاب! میں ویسے ہی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔" وہ بری طرح بدک گیا تھا۔

"ایسا لگتا ہوں میں تمہیں؟" اسے شاہل کی بات سے حقیقتاً" دکھ پہنچا تھا۔ "کیا میں کر سکتا ہوں ایسا تمہارے ساتھ۔" وہ اب دھیما پڑ چکا تھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ بس زخمی نگاہوں سے چند لمحے دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر نا سمجھی سے اس کا منہ تک رہا تھا۔

اس نے اٹھ کر اپنے سر سے دوپٹا کھینچا اور زمین پر ڈال دیا۔

زریاب اپنی جگہ سُن ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں خاموشی تھی۔ مکمل خاموشی۔ موت کا سناٹا۔ سوائے گھڑی کی ٹک ٹک کے۔ بیڈ کی چادر بے شکن تھی۔

سمٹے ہوئے پردے اور کمرے کے دروازے کے عین سامنے اور وسط میں پڑے غالیچے پر بے ہنگم انداز میں گرا ہوا اس کا وجود اپنی بے بسی اور لاچاری کی تصویر تھا۔

تربوزی رنگ کے دبیز غالیچے پر جگہ جگہ خون کے دھبے پڑ گئے تھے۔ ننھے ننھے، باریک۔ یہ خون اس کی کٹی ہوئی کلائیوں سے نکلا تھا۔ عریاں بازو چھپ چکے تھے اور برہنہ ٹانگیں ڈھانپ لی گئی تھیں۔ اس نے بہادرانہ قدم اٹھانے سے پہلے پوری آستینوں والی قمیص زیب تن کر لی تھی۔ نیم وا مردہ آنکھوں سے

زندگی کی خواہش نچڑ چکی تھی۔

خشک پپڑی زدہ ہونٹ کھلے سے رہ گئے تھے۔

پورا وجود کرب و اذیت کی عبارت بنا ہوا تھا۔ چہرہ بھیانک ہو کر اپنی شناخت کھو چکا تھا۔ چپٹی چکنے رخساروں کی جلد پھٹ کر گوشت باہر نکل آیا تھا اور آنکھیں اس اذیت پر ابل گئی تھیں۔ ہونٹ آدھے نیلے اور آدھے اپنی جگہ سے غائب ہی ہو گئے تھے۔ اس کی شکل دیکھنا کسی کمزور دل والے کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ معاً" دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک بار، دوبار، لگاتار، پھر کوئی ناب گھما کے اندر آ گیا۔

"نوما!"

"نوما۔۔۔ او مائی گاڈ۔" اندر داخل ہونے والا وجود تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"نوما۔" زمین پر گرے وجود کو سیدھا کرتے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سامنے کیسا منظر اس کا منتظر ہے۔ وہ نوما نہیں تھی۔ ایک بھیانک مسخ شدہ چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اگلے ہی لمحے پورا کمرا اس کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا وجود اس پر بیتنے والی سیاہ راتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا، لیکن وہ اتنی جلدی یقین کرنے کے قابل نہیں تھا۔

"تم۔" اس کے منہ سے سرگوشی نما سرسراہٹ نکلی۔ "تم پریگننٹ ہو شاہل!" اس کی آواز ایک ہلکی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"ہاں میں ماں بننے والی ہوں۔" وہ اس کے سامنے کھڑی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا کھڑا ہو گیا تھا۔

"تمہاری شادی ہو گئی۔ مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔" وہ جان بوجھ کے سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اس کا دوپٹا اٹھایا اور نرمی سے اس کے سر پر ڈال دیا۔

"میری شادی نہیں ہوئی صاب۔" شاہل اسے کسی غلط فہمی میں نہیں رہنے دینا چاہتی تھی۔

"میری شادی نہیں ہوئی پھر بھی میں ماں بننے والی ہوں۔" اس کی آنکھیں بے قراری سے دائیں بائیں بھٹک رہی تھیں۔ جیسے گھپ اندھیرے میں اپنی رہائی کے لیے روزن تلاش رہی ہوں۔ اس کا انتہائی لرزتا ہوا لہجہ۔ لحہ لحہ تیز ہوتا تنفس۔ زریاب کو اپنے سینے میں دھمک محسوس ہونے لگی۔

"اور میں.... میں نہیں جانتی اس بچے کا باپ کون ہے۔" زریاب کو اپنا وجود منوں وزنی بوجھ تلے دبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں اپنے بال جکڑ لیے تھے۔

"میں نہیں جانتی۔ میں نہیں جانتی۔" اس کی کیفیت یکسر بدل چکی تھی۔ وہ اب جنونی انداز میں اپنے بال نوچ رہی تھی۔ "میں نہیں جانتی۔ مجھے نہیں پتا۔ مجھے نہیں پتا۔"

اس کی آواز تیز چیخوں میں بدل گئی۔ رسولن دوڑی آئی۔ زریاب اپنی جگہ ساکن سا کھڑا تھا۔

رسولن کے بوڑھے وجود نے نحیف بازوؤں میں بھر کے اسے باہر کی سمت دھکیل دیا۔ اس کے بال بکھر چکے تھے۔ اوڑھنی گر گئی تھی۔ کمرے میں اب خاموشی تھی۔ شاہل کی چلاتی آوازیں، دور ہوتی جارہی تھیں۔ اسے لگا اگر وہ چند لمحے یہیں کھڑا رہا تو یقیناً "مفلوج ہو جائے گا۔ اس نے تھوک نگل کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

پھر گہری سانس بھر کے اپنے زندہ ہونے کا یقین کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔ ملازمین کے کوارٹر دور ضرور تھے، لیکن سامنے نظر ڈالتے ہی نظر آجاتے تھے مگر وہ وہاں نظر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

مسز رباب بے حد ماؤف ذہن کے ساتھ سر کو ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھیں۔

آج ان کی شخصیت میں وہ مخصوص دمک مفقود تھی جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں متاثر کر دیتی تھی۔ وہ بار بار اضطراب سے بالوں میں انگلیاں چلاتیں۔ انہیں سنوارنے کی کوشش میں مزید بگاڑ چکی تھیں۔

"ایک وہ ذلیل میری جان کو رو رہی ہے بیٹھ کے اور اب یہ دوسری نحوست۔" ان کے انداز، ان کی ہر پریشانی کو چیخ چیخ کر بیان کر رہے تھے۔

وہ نعیمہ عرف نوما پر بہت بھروسا کرنے لگی تھیں۔ ایک بار "کام" سے لگ جانے کے بعد اس نے انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھیں کہ وہ اس طرح کی بھیانک جرات بھی کر سکتی ہے۔ اگر انہیں ایک فیصد بھی اندازہ ہوتا تو شاید وہ کبھی اسے اکیلا نہ چھوڑتیں اور دوسری طرف شاہل نے انہیں پریشان کر ڈالا تھا۔ وہ پریگننٹ ہو چکی تھی، یہ بات سن کر وہ اچھی خاصی چراغ پا ہو گئی تھیں۔ یقیناً "وہ میڈیسن لینے میں ہیرا پھیری کرتی رہی تھی، لیکن کب اور کیسے۔ رسولن تک اس بات سے مکمل انجان تھی۔

زریاب کی آمد پر تو انہیں زمین آسمان اپنے سامنے گھومتے ہوئے لگ رہے تھے۔ ابھی نعیمہ والا معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑا تھا۔ انہیں اپنے پورے پورے تعلقات اور اختیارات کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ تب کہیں جا کے دبئی اعلا حکام کے ذریعے اس کیس کو پولیس کیس بننے سے بچایا تھا۔ وہ اپنے ملک میں جو چاہے کرتی پھرتیں، مگر بیرون ملک یقیناً "کسی اسکینڈل کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس واقعے کی دھول ابھی بیٹھی نہیں تھی کہ زریاب کے ان کے پاس فون پر فون آنے لگے۔ اس کا ایک ہی تقاضا تھا۔ وہ ان سے ملنا چاہتا تھا۔ جبکہ وہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھیں۔ انہیں شاہل کے لیے ابھی ایک نئی کہانی تیار کرنی تھی۔ ایک ایسی کہانی جس میں وہ بے گناہ ثابت ہوں اور شاہل کے ساتھ ہونے والی زیادتی بلکہ زیادتیوں کی تفصیل بھی نہ بتانی پڑے۔ سیل کی بجتی ہوئی ٹون نے انہیں سوچوں کے سمندر سے نکالا۔ دکھتا ہوا سر اٹھا کے انہوں نے سیل اسکرین کو دیکھا۔

"اوہ مائی گاڈ!" زریاب کی کال آرہی تھی۔

انہوں نے لائن کاٹ کے سیل آف کر دیا۔ انہیں سر کے درد میں اضافے کا احساس ہو رہا تھا۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھایا۔ ان کی سیکریٹری کھڑی تھی۔

"مس رائنہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آج کی تمام اپائنٹمنٹس کینسل کر دو۔ آئی ایم گوئنگ ٹو ہوم۔"

"اوکے میم۔"

"اور سنو۔" کچھ سوچ کر انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

"پاکستان میں موجود تمام "ورکنگ گرلز" میں یہ بات پھیلا دو کہ نوما کی ڈیتھ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہوئی ہے۔ کچھ بدخواہ اسے زبردستی سوسائیڈ کیس بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے گروپ کی دوسری تمام لڑکیوں اور گروپ انچارج انیلا رضوی کو بھی یہ خبر پہنچا دو۔"

"اوکے میم۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آپ کو سنبھالا اور مضبوط قدم اٹھاتی باہر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

وہ پورے انہماک سے آٹا گوندھنے میں مگن تھی۔ ذہنی رو کس سمت جا نکلی تھی۔ اس کی شکل سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔

"میں پوچھتی ہوں۔ آخر اس میں برائی کیا ہے۔" امی ابھی تک اسی بات کو لیے بیٹھی تھیں جس سے الجھ کر وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔

"اور میں پوچھتی ہوں۔ اچھائی کیا ہے۔" اس کے لہجے میں اطمینان تھا۔

"اے لو! کوئی ایک۔ اچھائیاں ہی اچھائیاں ہیں۔ تمہارا گھر بس جائے۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔ اور وہ نیک شریف ہے۔ کماؤ پوت ہے۔"

"امی!" اس نے کوفت سے گندھا ہوا آٹا اٹھا کر سلیب پر پٹخ دیا۔

"مت پڑیں میرے پیچھے۔ نہیں کرنا مجھے شادی۔" اس کی شکل بگڑ گئی۔

"پھر وہی ضد۔ کیوں نہیں کرنی۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔" امی ذرا کی ذرا چپ ہو کے پھر شروع ہو چکی تھیں۔

"کوئی وجہ نہیں، میں کیا وجہ بتاؤں آپ کو۔" گیس کا بٹن پورا کھول کر اس نے جلتی ہوئی تیلی اس میں جھونکی۔ بھڑ بھڑ آگ جل اٹھی۔ اسے لگا امی نے بھی ایسی ہی ایک جلتی ہوئی تیلی پھینک کر اس کی زندگی جلا کر راکھ کر دی۔

"اتنا اچھا رشتہ بیٹھے بٹھائے گنوا دوں؟"

"کوئی کتنا بھی اچھا ہو۔ مجھے اس کی اچھائیوں، برائیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔ امی مایوس ہو گئی تھیں۔

"کبھی نہ کبھی زندگی میں بے تکے فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں اور بے سر پیر کے جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں۔" چولہے سے نکلتی تپش سے بے نیاز وہ وہیں کھڑی سوچے گئی۔

☼ ☼ ☼

اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔

زریاب نے جان بوجھ کر یہ وقت منتخب کیا تھا۔ اسے محسوس ہو گیا تھا کہ رباب آنٹی اس سے ملنے سے کترا رہی ہیں اور وہ صاف منع بھی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے حیلے بہانوں سے اسے ٹال رہی ہیں۔ سوجی آنکھوں کو بمشکل کھولے وہ بڑے مرے مرے قدم اٹھاتی ساڑھے آٹھ بجے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ ملازمہ نے سات بجے ہی ان کو زریاب کی آمد کی اطلاع دے دی تھی اور ان کی نیند تب ہی اڑ گئی تھی۔

"تم نے اسے بتا دیا کہ میں گھر پر ہوں۔" صبح کے سات بجے اس سوال کی کوئی تک نہیں تھی۔

"جی بیگم صاحبہ!" انہوں نے دل ہی دل میں اسے گالیوں سے نوازا۔ پھر بولیں۔

"کہہ دو میں ابھی سو رہی ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے ہی سوئی ہوں۔ ایک بجے تک اٹھوں گی۔ آپ تب آجائیے گا۔" انہوں نے کہلوا کر اطمینان کرلیا تھا مگر ملازمہ الٹے پیروں واپس آگئی۔

"وہ کہہ رہے ہیں میں انتظار کرلوں گا اور تب تک شاہل سے بھی مل لوں گا۔" ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"کہاں ہے وہ ابھی ڈرائنگ روم میں ہے نا۔ گیا تو نہیں کوارٹرز کی طرف۔" ان کی آواز تک سے گھبراہٹ مترشح تھی۔

"اچھا تم ایسا کرو۔ مشعل کو جگاؤ اور کہو اس منحوس کو لے کر ابھی گاؤں نکل جائے اپنے۔" ملازمہ نے سمجھ کے سرہلایا۔

"اور سنو۔" انہوں نے مزید تانے بانے بنے۔ "زریاب کو ناشتا دو۔ وہ اٹھ کر باہر نہ جانے پائے اور مشعل سے کہنا۔ بیگم صاحبہ نے کہا ہے پانچ منٹ بعد اس کوٹھی میں دکھائی مت دینا۔"

"جی۔" ملازمہ پلٹی۔

"اور سنو۔" انہیں جیسے مزید کچھ یاد آیا۔

"آ۔۔۔ آ۔۔۔ زریاب سے کہو۔ بیگم صاحبہ تھوڑی دیر میں آرہی ہیں۔ اتنی جلدی ان سے اٹھا نہیں جارہا۔ وہ اطمینان سے ناشتا کرے اور۔۔۔ اگر وہ شاہل کا پوچھے تو کہنا کہ بیگم صاحبہ نے اس کی شادی کروادی اور اسے اس کے سسرال بھجوادیا گاؤں۔" ملازمہ کے جانے کے بعد وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگیں۔

وہ کسی قیمت پر زریاب سے ملنا نہیں چاہتی تھیں اور ذہنی طور پر اس پیشی کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ ان کا خیال تھا زریاب کچھ دیر ان کا انتظار کرکے وہاں سے چلا جائے گا پھر بھی وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے ایک بہت مربوط کہانی بن رہی تھیں۔

اب نیند کس کم بخت کو آنی تھی۔

آٹھ بجے ان کے پوچھنے پر ملازمہ نے یہ حوصلہ شکن جواب دیا کہ زریاب نے ناشتا نہیں کیا۔ وہ گھر سے کرکے آیا ہے اور ابھی تک ڈرائنگ روم میں انتظار کررہا ہے۔ انہوں نے بے اختیار ایک گہری سانس کھینچ کر خود کو پرسکون کیا۔

"اوکے۔ اس سے کہو۔ میں آتی ہوں۔"

منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر انہوں نے باقی حلیے کو یونہی بکھرا رہنے دیا تھا۔ وہ اپنی شخصیت سے پورا تاثر یہ دینا چاہتی تھیں کہ وہ صرف اس کے انتظار کرنے کی وجہ سے کچی نیند سے اٹھ کے آئی ہیں۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے انہوں نے کھڑکی سے پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی غیر موجودگی کا یقین کیا۔ مشعل یقیناً شاہل کو لے کر وہاں سے جاچکا تھا۔

"کیا زریاب! اتنی سی بات کے لیے۔ اس پاگل کے لیے پریشان تھے تم۔" وہ یوں بولیں۔ گویا جس واقعے نے تمہاری نیندیں حرام کردی ہیں۔ وہ تو اصل میں کوئی بات ہی نہیں۔

"نہ یہ اتنی سی بات ہے۔ نہ وہ لڑکی پاگل ہے۔" وہ انہیں کچھ ناراض سا لگا۔ یقیناً "شاہل کی بربادی کا ذمہ دار وہ انہیں سمجھ رہا تھا جو کہ حقیقت میں کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

"دیکھو زریاب جیسا تم سوچ رہے ہو۔ ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "شاہل کی اس حالت کی ذمہ دار میں نہیں۔ وہ خود ہے۔" وہ نا سمجھی سے الجھ کے انہیں دیکھنے لگا۔

"معاشقہ چل نکلا تھا اس کا میرے نئے ملازم کے ساتھ 'بلکہ میرے لیے تو دونوں ہی نئے تھے۔" انہوں نے بات میں ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔ "میں اسی لیے بغیر چھان بین کے کسی کو اپنے پاس نہیں رکھتی اور وہ بھی کل وقتی ملازمت۔ شاہل کو تم لے کر آئے تھے۔ اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔ بغیر سوچے سمجھے۔ روٹی' کپڑا' چھت' روزگار سب کچھ دیا اسے۔" انہوں نے زریاب پر احسان جتانے کی کوشش کی۔

"ایک تو وہ بھی کم عمر لڑکا تھا۔ شاہل کی عمر کا ہی ہوگا۔ دوسرے اس کا تعلق بھی انہیں سرحد سے تھا۔ دونوں ہی جوان تھے اور ایک دوسرے کی زبان سمجھتے

تھے۔ وہ بھی سیلاب کی بربادیوں کا مارا تھا۔ یہ بھی۔ دکھ سکھ کہہ لینے میں کوئی برائی نہیں تھی' مگر مجھے کیا پتا تھا کہ یہ کھیل کھیلنے لگیں گے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں تھے اسے آئے۔ دیا ہوگا شادی کا جھانسہ اور یہ بیگم صاحبہ آگئیں اس کے دام میں۔" انہوں نے اپنی شکل ایسی کرلی گویا انہیں بھی شاہل سے اس نادانی کی امید نہیں تھی۔ کن انکھیوں سے زریاب کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اس پر ان کی کہانی کا اثر ہورہا تھا۔

"مجھے تو تب پتا چلا جب وہ چھٹیاں لے کر نکل گیا گاؤں اور واپس ہی نہیں آیا۔"

"پھر؟" زریاب کو مگو کی کیفیت میں گھر گیا۔

"پھر کیا۔ مجھے تو جب پتا چلا۔ میں نے تو شامت بلادی اس کی۔۔۔" وہ جیسے ساری کہانی مکمل کرکے اطمینان سے بیٹھ گئیں۔ زریاب سر نیچے کیے سوچ میں ڈوب گیا۔ شاہل کی حالت کچھ اور کہتی تھی اور رباب آنٹی کی کہانی کچھ اور۔

"مجھے ابھی آپ کی میڈ نے بتایا کہ آپ نے اس کی شادی کروی۔" اس کی آواز میں ابھی بھی شک بھرا ہوا تھا۔

"تو اور کیا کرتی پھر۔ اتنے اثر و رسوخ والی عورت ہوں۔ ایک معمولی سے بندے کا پتا لگانا میرے لیے مشکل تھا کیا۔ لو فوہ زریاب!" انہوں نے اکتانے کی جان دار اداکاری کی۔

"اتنے فکر مند کیوں ہورہے ہو۔ اس کے لیے ذہنی حالت بگڑتی جارہی تھی اس کی۔ تم ملے تو تھے۔ اندازہ ہوا تو تھا ہوگا تمہیں۔" انہوں نے بڑے دھیان سے اس کا چہرہ جانچا۔

"ہوں۔۔۔" وہ پرسوچ انداز میں سرہلا کر رہ گیا۔

"مجھے بہت دکھ ہوتا تھا اسے دیکھ دیکھ کر۔ میں نے تو کہا تھا کہ۔۔۔ مگر وہ مانی ہی نہیں۔ اس پر اس کی بہکی بہکی باتیں اور اتنی رف کنڈیشن۔ مجھے ڈر تھا وہ کہیں اپنے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچالے۔" انہیں اندازہ تھا۔ شاہل سے ہمدردی ہی ان کے لیے سود مند رہے گی۔

انہیں خود بھی اپنی صلاحیتوں پر بہت بھروسا تھا اور زریاب تو یوں بھی دل و ذہن کا صاف اور شریف آدمی تھا۔ اوپر سے رباب آنٹی پر اس کا اعتبار اور بھروسا کوئی ایک دو دن' نہیں' سالوں پرانا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مسز رباب بہت دھیان سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کررہی تھیں۔

"دیکھو زریاب!" وہ بہت ہمدردی سے اٹھ کر اس کے پاس آبیٹھیں۔ "تم میرے لیے بیٹے جیسے ہو۔" انہوں نے آستین سے بے نیاز ہاتھ اس کے کاندھے پر ٹکایا۔

"اللہ نہ کرے۔" زریاب کے دل سے بے اختیار صدا نکلی۔ وہ ابھی تک اپنے نائٹ میں ملبوس تھیں۔ زریاب سے نظر اٹھا کے ان کی طرف دیکھنا مشکل ہورہا تھا۔

"اس لیے بہت خلوص سے تمہیں مشورہ دے رہی ہوں۔ کسی کے دکھ میں اس سے ہمدردی کرنا اچھی بات ہے' لیکن دوسروں کے مسائل کو اتنا سر پر سوار مت کیا کرو کہ جینا مشکل ہوجائے۔ زندگی میں اپنے دکھ کیا کم ہیں جو تم دوسروں کے روگ بھی پال لیتے ہو۔"

زریاب بنا کچھ کہے اپنے ہاتھوں کو گھورتا رہا۔



وہ آج بہت دن کے بعد اپنا لاکر صاف کروا رہا تھا۔ پچھلے چند مہینے اتنے اپ سیٹ گزرے تھے کہ اس نے اپنے آفس روم' کیبنٹس اور لاکر کی طرف بالکل توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اکتایا ہوا کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسی وقت فضل داد نے ایک لفافہ اسے پکڑایا۔

"یہ آپ کے نام کی رجسٹری آئی تھی جی۔ بہت دن ہوگئے۔" اس نے سرسری انداز میں دیکھا۔ پھر چونک گیا۔ اس پر دبئی کی مہر تھی۔

وہ تیزی سے لفافہ چاک کرنے لگا۔

اندر موجود تحریر نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔

”میرے بہت اچھے دوست زریاب!

یہ میں ہی ہوں نعیمہ۔

جب تم یہ خط پڑھ رہے ہوگے۔ میں اس دنیا سے جاچکی ہوں گی۔ شاید یہی میری قسمت تھی' یہی نصیب۔ میں نے یہ خط تمہیں صرف یہ کہنے کے لیے لکھا ہے کہ ہوسکے تو امی اور مجھے معاف کردینا۔ انہوں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ رشنا تمہاری بہن نہیں ہے۔ نہ سگی نہ رضاعی۔ وہ صرف تمہاری خالہ زاد تھی۔ جس سے نہ تمہاری پسندیدگی کوئی جرم تھی۔ نہ نکاح کوئی گناہ۔

امی چاہتی تھیں تمہاری شادی مجھ سے ہوجائے۔ شاید میں خود بھی یہی چاہتی تھی' مگر زندگی مجھے اس جھوٹ کی سزا اتنی بھیانک شکل میں دے گی۔ مجھے پتا ہوتا تو کبھی تم سے جھوٹ نہ بولتی۔

تم نے مجھے پہچان لیا۔

میری بدقسمتی پر لگنے والی آخری مہروہ پہچان کے رنگ تھے' جو تمہاری آنکھوں میں' میں نے اس وقت دیکھ لیے تھے۔ جب تم نے مسز رباب کی پارٹی میں مجھے دیکھا تھا۔ مسز رباب سے میرا کیا رشتہ تھا۔ میں وہاں تک کیسے پہنچی اور کیوں؟ یہ ایک الگ کہانی ہے۔

میں نے جو انکشاف اس خط کے ذریعے تم پر کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتی اسے جان لینے کے بعد تم مزید کوئی آگہی برداشت کرنے کے متحمل ہوسکوگے۔ سو اس بحث کو لاحاصل جان کر یہیں ختم کردو اور بھول جاؤ کہ زندگی میں کبھی تم نعیمہ نام کی کسی لڑکی کو جانتے بھی تھے۔

بس ایک آخری گزارش یہ ہے کہ میری ماں کو میری حقیقت کا علم کبھی نہ ہونے دینا۔ اب تک تو وہ مجھ پر رو دھو کر صبر کرچکی ہوں گی' جو بھی کہانی تم کو سنائیں۔ خدارا اس پر یقین کرلینا۔

فقط تمہاری معافی کی طلب گار' ایک گناہ گار' لیکن پشیمان لڑکی۔“

کاغذ اس کے ہاتھ میں اٹکا رہ گیا۔ اس نے بہت تیزی سے سامنے کے منظر کو دھندلاتا اور پھر نمی کو آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہتا ہوا محسوس کیا۔

”سائیں۔ سائیں!“ فضل داد نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا' لیکن وہ اس وقت وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ فضل داد نے جو اپنے اتنی مضبوط شخصیت والے سرکار سائیں کو روتے دیکھا تو گھبرا کے آفس سے نکلا۔

وہ آئمہ کے کمرے کی طرف جارہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنی ہی سوچوں میں گم اس نے بنا پوچھے دروازہ کھول دیا تھا۔

”آپ!“ سامنے کھڑے بابر سلطان کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

”میں اندر آسکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ بہت مہذب اور سنجیدہ تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کے اندر آنے کا راستہ دیا اور امی کو بتانے چل دی۔

اس نے امی کو روتے دیکھا اور چائے کا پانی رکھنے لگی۔ ماضی میں ہی سہی' بہرحال وہ اس گھر کا داماد تھا۔ امی اسے دیکھ کر ٹھیک ٹھاک جذباتی ہوچکی تھیں۔ بظاہر تو وہ بھی بڑا مغموم نظر آرہا تھا۔

”کیا بتاؤں بس' میں تو خود ابھی تک شاکڈ ہوں۔ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ اس قدر جلدی' اتنی اچانک۔ چلی جائے گی۔ سچ ہی ہے۔ رب کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔“ وہ بجھے بجھے انداز میں انہیں تسلیاں دے رہا تھا۔

”ہائے میں تو اپنی بچی کی شکل بھی نہ دیکھ سکی۔“

”غم مت کریں آنٹی! یہی حال میرا ہے۔ میں خود کون سا دیکھ سکا اسے آخری ٹائم میں۔ میں خود ہاسپٹلائز تھا۔ کب اس کی ڈیڈ باڈی آئی۔ کب تدفین کردی۔ بس جب ہوش آیا تو پتا چلا کہ اس کی حالت اتنی خراب ہوچکی ہے کہ زیادہ دیر تک رکھ نہیں سکتے تھے۔ اور پاکستان لے کر کون آتا۔ مجھے تو اپنا ہی ہوش نہ تھا۔“ وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ رشنا یہ ساری تفصیل فون پر سن چکی تھی۔

”آپ کو کتنے دن ہوئے پاکستان آئے۔“ اس نے بہت اچانک ہی سوال کیا تھا۔ اس نے سنبھل کر رشنا کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں گویا جم سی گئیں۔

”میں کل ہی تو پہنچا ہوں۔ پندرہ دن پہلے اسپتال سے ڈسچارج ہوا۔ پھر کچھ دن بیڈ ریسٹ کیا۔“

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اس کی گہری نگاہیں اپنے وجود پر محسوس کرکے الجھ رہی تھی۔

”لیکن سچ پوچھوں تو ایک بے چینی سی لگ گئی تھی دل کو۔ جب تک آپ سے مل نہ لوں' چین نہیں پڑے گا جی کو۔“ وہ چائے کا خالی کپ میز پر ٹکا کر پھیل کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کی گہری نگاہیں اپنے وجود پر محسوس کرکے الجھ رہی تھی۔ یقیناً“ اس کا ابھی مزید بیٹھنے کا ارادہ تھا۔

وہ جز بز سی ہوئی کیوں کہ زیادہ دیر تک اس کی آرپار ہوتی نظریں برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

وہی پرانے راستے تھے' مگر آج کچھ گم گشتہ منزلیں اس کے انتظار میں تھیں۔ فضل داد ڈرائیو کررہا تھا۔ اس کی آنکھیں خوشی کا ایک الگ ہی رنگ لیے باہر کے مناظر پر پھسل رہی تھیں۔ ہونٹوں پر کبھی جدا نہ ہونے والی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں کی دہلیز نم تھی' مگر خوشی اس کے دل میں ایسے پر پھیلائے کھڑی تھی گویا آنسوؤں کی ایک بھی بوند دل کی اس ہریالی کھیتی پر گرنے نہیں دے گی۔ ماضی میں گزرا اک اک پل اس کی نگاہوں میں کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔

سورج کی وداعی کا منظر تھا۔ وہ مغرب میں ڈوبتے نارنجی گولے کی شعاعوں کی خوب صورتی بھی اپنے دل پر محسوس کررہا تھا۔ فضا میں مغرب کے بعد کا اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ جب کسی کے رونے کی بہت ننھی سی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

جس طرح وہ سن کے ایک دم چونکا تھا۔ اسی طرح فضل داد کا پاؤں بھی بے اختیار بریک پر جاپڑا تھا۔ یہ کسی چھوٹے سے گاؤں کی حدود تھیں۔ کچے گھروں کی رسوئیوں سے خوشبودار دھواں اٹھ کے فضاؤں میں گھل مل رہا تھا۔

”تم یہ آواز سن رہے ہو نا فضل!“

”جی سائیں پر۔۔۔“ اس کا انداز رکا رکا سا تھا۔ ”یہ قبرستان کی پیچھے والی دیوار ہے اور سائیں وقت بھی مغرب کا ہے۔“

”تو“

”سائیں ایسے وقت میں' ایسی جگہوں پر۔“ وہ سمجھ گیا تھا وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

”فضول باتیں نہ کرو اندر چلو۔ گاڑی گھماؤ جلدی۔“

گاڑی گھما کے وہ دروازے کے سامنے لایا اور فضل کو ساتھ لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ قبرستان کا رقبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اسی لیے انہیں آواز کے منبع تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی۔

اور' پھر وہاں جو منظر اس نے دیکھا۔۔۔۔

اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

فضل نے بہت احتیاط سے روتے ہوئے بچے کو اٹھا کر اپنی گرم شال میں لپیٹ لیا جبکہ وہ ہارے ہوئے جواری کی مانند گھٹنے زمین پر ٹکا کر گر سا گیا۔

ایک زندگی کی حرارت سے آزاد' مجبور' لیکن معدوم چہرہ خدا کے حضور قسمت کی اس بے وفائی پر شکوہ کناں تھا۔ اس نے اس کا بے جان اور لاچار وجود اٹھا کے بانہوں میں بھرلیا۔

”میں' تم سے کیسے معافی مانگوں گا شاہل!“ ضبط کی لاکھ کوششوں کے بعد بھی ایک زخمی آہ اس کے دل سے نکل کر لبوں تک آہی گئی۔

چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ذرا دیر میں اس کی وہاں موجودگی کی دھوم مچ گئی۔ اسے اور بچے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے بچے کی مالش اور غسل وغیرہ کرکے اسے پرسکون کردیا۔ کوئی بھی شاہل کی شناخت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ان کے گاؤں کی تھی ہی

نہیں۔ گورکن سے بات کر کے قدرے الگ تھلگ سی جگہ پر اس کی قبر بنوائی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اسے سپرد خاک کر کے مٹی ڈالی۔

فضل داد نے اپنے سائیں کو کبھی اتنا مغموم نہیں دیکھا تھا۔ جتنا ان دو دنوں میں۔

☼ ☼ ☼

"یہ اچھائی کیا کم ہے کہ ایک بار پھر وہ یہیں چلا آیا۔" وہ کچھ کسے ان کی عقل پہ ماتم کرتی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

"اس چلے آنے نے ہی تو کھٹکا دیا ہے مجھے۔"

"اس میں کھٹکنے کی کیا بات ہے۔"

"کھٹکنے کی بات ہے امی! اتنا امیر کبیر آدمی' ایک ایسی غریب لڑکی سے شادی کرنا ہی کیوں چاہتا تھا جس کے پاس نہ خوب صورتی تھی نہ تعلیم' نہ اس کی کلاس کے ادب آداب۔ چلو' مانا کہ نیکی کرنے کا خیال اس کے دل میں آگیا یا اس کا سر پھر گیا۔ مگر اب اس کے گزر جانے کے بعد دوبارہ پھر اس بے نام ونشان گھر کی دوسری لڑکی سے شادی رچانے آگیا۔ کچھ تو عقل کے ناخن لیں امی! انسان ایک بار کیچڑ میں گرا کنول اٹھا سکتا ہے' لیکن بار بار نہ تو وہ سارے کنول اٹھا سکتا ہے نہ' اپنے کوٹ کے کالر میں سجا سکتا ہے۔"

"کہنا کیا چاہ رہی ہے تو۔"

"صرف یہ کہ وہ اتنا بھی سیدھا نہیں ہے' جتنا آپ کو لگتا ہے۔" اسے اس کی گستاخ نظریں یاد آئیں۔

"اس کے دوبارہ یہاں آنے میں کوئی نہ کوئی غرض ہے۔ جو فی الحال مجھے نظر نہیں آرہی' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس بار بھی سب کچھ پہلے جیسا اس کی مرضی کے مطابق ہوتا رہے گا۔"

"کیا مطلب؟" امی ٹھٹک گئیں۔

"مطلب یہ کہ میں اس سے شادی کروں گی نہ ہی اسے اتنی اجازت دوں گی کہ وہ جب چاہے یہاں آجائے۔" اس کا لہجہ حد درجے تیز تھا۔

"وہ داماد ہے میرا۔"

"ہے نہیں تھا۔" وہ چیخ کر بولی اور بالٹی میں رکھے کپڑے زور زور سے جھٹک کر الگنی پر ڈالنے لگی۔

امی کی بڑبڑاہٹیں شروع ہو چکی تھیں' لیکن اسے پروا نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

وہی سفر تھا۔ وہی راستے۔ وہی سوچیں۔ بس اس سفر میں ان دونوں کے ساتھ ایک ننھے وجود کا اضافہ ہو چکا تھا۔

زریاب نے اس کا معصوم چہرہ دیکھا اور پیشانی چوم لی۔ پورے چاند کا سفر جاری تھا اور اس کی رنگا رنگ بچوں کا بھی۔

ابھی اسے رابعہ کو فون کر کے اس حقیقت سے آگاہ کرنا تھا جو اس کی زندگی کا روگ بن گئی تھی' مگر دراصل حقیقت تھی ہی نہیں اور اس معصوم جان اور اس کی بے گناہ ماں پر بیتنے والی ناانصافی کا ذکر بھی کرنا تھا۔

مسز رباب کی اصلیت اس پر آشکار ہو چکی تھی' لیکن وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکی تھیں۔ ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں وہ مفلوج ہو گئی تھیں۔ ریڑھ کی ہڈی پر شدید چوٹ آئی تھیں۔ ان کی بینائی بھی کھو چکی تھی۔ ایک اندھی' مفلوج عورت عبرت کا نشان تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر کچھ نہ کہہ سکا تھا صرف اتنا ہی منہ سے نکلا تھا۔

"یہ سزا تو دنیا میں ملی ہے۔ آخرت ابھی باقی ہے۔ اگر کچھ بھلائی کے کام کر سکتی ہیں تو کر لیں۔ جن لڑکیوں کو آپ نے اپنے گناہوں میں شامل کیا ہے انہیں آزاد کر دیں۔"

مسز رباب کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ آج پھر آیا بیٹھا تھا اور اس کا آنا اب تو روز کا معمول بن گیا تھا۔ امی کی شہ پا کر اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ اس سے دوبدو شادی کی بات کرنے بیٹھ

گیا۔ رشنا کا جی چاہا سامنے رکھی ٹرے اٹھا کے اس کے سر پہ دے مارے۔

"میں آل ریڈی کمیٹڈ ہوں۔ آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ نہ کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے بہت تحمل سے بات مکمل کی۔

"آپ کی کمٹ منٹ والی بات کی حقیقت سے میں واقف ہوں۔" اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔

"میری مرضی۔ اس سے بہتر جواب نہیں ہے میرے پاس۔"

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہ ہوا نا۔" وہ حد درجے مطمئن تھا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا سوال۔" وہ ایک دم ہی اخلاقیات کی تمام حدود پار کر کے آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ ایک پل کے لیے اس کی آنکھوں میں سفاکی کی عجیب سی چمک لہرائی۔ وہ جو ایک دم نڈر سی ہو کے کھڑی تھی۔ ڈر سی گئی' لیکن اس پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"براہ مہربانی میری بات مانو۔ روز روز مت آیا کرو۔ میرا دماغ خراب ہوتا ہے اور ریپوٹیشن بھی۔" اس کی ادھوری بات ہونٹوں میں دبی رہ گئی۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ امی دیکھنے کے لیے باہر گئیں اور اس نے اس تنہائی کا فائدہ اٹھا کر اس کی کلائی دبوچ لی۔ وہ حق دق رہ گئی۔ اس کی گرفت اس قدر آہنی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ریپوٹیشن کس چڑیا کا نام ہے' تمہیں پتا ہے۔"

اس کا لہجہ' اس کی گرفت اور اس حرکت کے برعکس بالکل ٹھنڈا تھا۔ رشنا کی سانس تک رک چکی تھی۔ خوف زدہ نظریں اس کی سفاک آنکھوں میں اٹک گئی تھیں۔

"ایک بار میرے پاس آجاؤ۔ بہت اچھی طرح سمجھاؤں گا۔"

وہ ابھی بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی اٹکی ہوئی سانس رک رک کر باہر نکلی۔ عین اسی وقت کسی نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھا۔

☼ ☼ ☼

وہی گلیاں تھیں۔ وہی کوچے۔

وہی در و بام تھے۔ وہی چوبارے۔

یادوں کا دھاگا گرہ گرہ بندھا اس کے دھیان کی پتنگ کو تھامے' تصور کے آسمان پر ڈھیلا اور ڈھیلا ہوتا جا رہا تھا۔

کتنے ہی خوشیوں بھرے' انمول لمحات' دبے پاؤں اس کی یادوں کے تاج محل کی دہلیز تک چلے آئے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں چمکتی ہوئی نمی۔

کب سوچا تھا اس نے۔ کسی دن اچانک کسی کا خط اس کے لیے دوبارہ زندگی کی نوید لے آئے گا۔ اور اگر...... اگر نعیمہ جاتے جاتے اس پر احسان نہ کر جاتی تو... اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

اپنی پچھلی زندگی کے گزارے گئے ویران ماہ و سال۔ اس کے اجڑے دل میں اڑتی جدائی کی دھول کے گواہ تھے۔ وہ دھول جو دن رات کے کتنے ہی لمحوں میں چپکے سے اس کی آنکھوں میں جا پڑتی اور اسے ہر جگہ سے نظریں چرا کے اپنی آنکھیں صاف کرنی پڑتیں۔

اداسی کا ایک لمحہ بہت چپکے سے دل کے کسی کھونے سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اس نے دھیان سے موڑ کاٹا۔

وہی زنگ آلود' رنگ اڑا ہوا دروازہ' کچھ اور بھی خستہ حال سا اس کے سامنے تھا۔ چند لمحے تو اس نے اس دروازے کو تکتے ہوئے گزار دیے۔ داہنے ہاتھ کی طرف ذرا اوپر۔ کبھی یہاں کال بیل ہوتی تھی۔

وہ دن رات اسے ٹھیک کرنے کو کہتی رہی اور وہ ٹالتا رہا۔ پھر' شاید کبھی کوئی اس پر انگلی رکھنے والا نہ آیا۔ نہ گھر کے مکینوں کو کسی کی آمد کی اطلاع کی ضرورت ہی رہی۔ اس نے سوچوں سے پیچھا چھڑا کر سر جھٹکا اور دستک دی۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل چکا تھا۔ ایک بوڑھا مگر جانا پہچانا چہرہ اس کے سامنے تھا۔

"زریاب!" لرزتی ہوئی آواز میں بے یقینی بھر گئی تھی۔ سامنے دھوپ کی چمک میں مسکراتا چہرہ وہ کیسے بھول سکتی تھیں۔

ان مسکراتے لبوں سے ہنسی خود انہوں نے ہی تو نوچی تھی۔ ایک سفاک جھوٹ بول کے۔ ایک لمحے میں خوشی اور غم کے کتنے ہی موسم ان گدلی آنکھوں میں لہرائے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ عجب عالم خود فراموشی ان پر طاری تھا۔ پھر وہ مسکراتا چہرہ ان کی طرف بڑھا اور اس نے ان کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ خود فراموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کے آنسو بہانے لگیں۔ وہ ان کا سر تھپکتا رہا۔

"روشی اندر ہے۔" تھوڑی دیر بعد وہ الگ ہو کے سنبھل کے بولیں۔ وہ کہتے ہوئے بالکل بھول ہی گئیں کہ اندر روشی اکیلی نہیں ہے۔

ڈھیروں آرزوئیں' لبوں سے پھوٹتی بے ساختہ ہنسی اور دل میں اندنا گدگدی کا انوکھا احساس لیے وہ اندر بڑھا اور کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا۔ لیکن وہاں کا منظر اس کے گمان سے بہت دور تھا۔

ایک اجنبی مرد اور استحقاق سے جکڑی اس کی کلائی۔ اس کا دل ایک لمحے میں پوری زندگی بھلا کر سکڑا۔ سہمی چڑیا کی طرح خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رشنا اس کی زندگی' حاصل زیست۔ رشنا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"زریاب!" بے آواز سرگوشی لبوں سے نکل کر فضا میں پھیل گئی۔

اس کی کلائی آزاد ہو گئی اور وہ جیسے کسی خواب سے جاگ اٹھی۔

"زریاب!" اب کی بار ایک قدم بڑھا کے اس کے نام کی پکار یوں تھی گویا "یہ تم ہو؟"

"زریاب۔" تمام شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر وہ چیخی اور بھاگ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔ زریاب نے کسی متاع جان کی طرح اسے سمیٹ لیا تھا۔ اس کا نام کسی تسبیح کے ورد کی طرح لبوں پر جاری تھا اور وہ بری طرح رو رہی تھی۔ زریاب نے اسے اپنے فراخ سینے میں سمو لیا تھا۔ برسوں سے جلتی آگ پر ٹھنڈے چھینٹے پڑ گئے تھے۔

"روشی... روشی۔" اور ہر بار اس نے پکارے جانے پر جواب دیا تھا۔ جیسے اس کے ساتھ ساتھ خود کو بھی اس منظر کی سچائی کا یقین دلانا چاہتا ہو۔

یہ چہرہ' یہ آواز' یہ مانوسیت' یہ محبت۔
اس کا اثاثہ کھو گیا تھا۔ آج واپس ملا تھا۔

کمرے میں کھڑا آدمی بالکل نامحسوس انداز میں ایک طرف سے ہو کر باہر نکلا اور صحن میں نم آنکھوں سے کھڑی امی کو نظر انداز کرتا تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ کیوں کہ وہ زریاب کو جانتا تھا اور مسز رباب سے اس کے تعلق کو بھی۔

"اب بھی کیوں آئے ہو۔ میرے مرنے کا انتظار تو کرتے۔" کتنی دیر رو چکنے کے بعد اب وہ ہلکے ہلکے سسک رہی تھی۔

"آج تو یہ بات کہہ دی ہے آئندہ مت کہنا۔" اس نے ہاتھوں کے کٹورے میں وہ مانوس چہرہ تھاما۔

"کیوں کہ بہت سے پیاروں کی جدائی دیکھ چکا ہوں۔ بنا انتظار اور بنا کسی خواہش کے۔ اب کسی کو کھونے کی سکت نہیں ہے۔" اس کی آواز میں صدیوں کے دکھ بول رہے تھے۔

"مجھ میں بھی نہیں ہے۔" دونوں کی آنکھیں نم تھیں مگر وجود ہنسی کی گیلی پھوار میں بھیگ رہے تھے۔

